مقالاتِ شامِ ہمدرد

مرتبہ : حکیم محمد سعید

شامِ ہمدرد کی انجمن میں روشن ہونے والی وہ شمعیں ہیں، جو پاکستان کے نادرۂ روزگار علماء، شعراء، سائنسدانوں، ماہرینِ تعلیم اور قانون دانوں نے روشن کی ہیں اور جن کی روشنی سے اردو زبان کے آفاق صدیوں تک منوّر رہیں گے ——————

بڑے سائز کے ۳۰۰ صفحات	قیمت : ——
آفسٹ طباعت ——	کاغذی جلد ۷/۵۰
آرٹ پیپر پر ۲۰ تصاویر	مجلد خاص -/۱۵

—— ناشر ——

مکتبہ جدید ۴۔ شارع فاطمہ جناح۔ لاہور

اسرار احمد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تذکرہ و تبصرہ

ماہِ ستمبر کا 'میثاق' شائع ہی نہیں ہو سکا۔ اگست کے شمارے میں ان صفحات میں "مجوزہ تعلیمی پالیسی" پر محترمی ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب کا مقالہ شائع ہوا تھا۔ الغرض قارئینِ 'میثاق' کی خدمت میں راقم کی حاضری پورے تین ماہ بعد ہو رہی ہے۔

سالِ رواں کے اس ربع ... کے دوران میں جو واقعات عالمِ اسلامی میں رونما ہوئے اور جن حوادث کا سامنا امتِ مسلمہ کو رہا ان کی یاد سے کلیجہ شق ہوتا ہے، اتنے گوناگوں مصائب اور ایسے پے بہ پے حوادث کہ انسان حیران و پریشان ہو کر رہ جائے کہ ع

"حیراں ہوں، دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں!"

ایک طرف مسجد اقصیٰ کو نذرِ آتش کیا گیا اور عالمِ اسلامی کے روحانی مراکز میں سے تیسرا عظیم ترین مرکز، حرمِ ثالث، اور ان تین مقدس ترین مقامات میں سے ثالث ثلٰثہ جن کی زیارت کی نیت سے شدّ رحال کی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی ہے —————— آگ کے شعلوں میں لپٹ کر پورے عالمِ اسلام کے لئے مجسم دعوتِ آہ و فغاں بن گیا ؏

"روئے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونناب بار
وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار!!"

پورا عالمِ اسلام بے قرار ہو گیا، قلوب مضطرب ہو گئے، روحیں بے چین ہو گئیں، غم و اندوہ اور غیظ و غضب کی ایک لہر پوری ملتِ اسلامی کے جسد میں دوڑ گئی —————— لیکن آخر بجز "قہرِ درویش بر جانِ درویش" کے سوا کچھ نہ ہو سکا۔ پوری ملتِ اسلامی بس تلملا کر رہ گئی۔ اس لئے کہ : ع

"ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات !"

جس طرح لمبا اوقات کبوتر بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لینے ہی میں عافیت دیکھتا ہے اسی طرح جی چاہتا ہے کہ اس صورتِ حال کے عواقب سے بھی آنکھیں بند کر لی جائیں اور قطعاً نہ سوچا جائے کہ یہ سلسلہ کہاں جا کر رکے گا !! ——— بصورت دیگر سخت مایوسی کا سامنا ہوتا ہے ۔ اعصاب جواب دینے لگتے ہیں اور نبضیں چھوٹتی محسوس ہوتی ہیں ——— دشمن ہمیں ٹٹول رہا ہے اور رفتہ رفتہ ہماری کمزوریوں سے آگاہ ہوتا چلا جا رہا ہے ۔ صورتِ حال یک دم تبدیل ہو گئی ہے ——— اور دفعتہً عالم ارضی کی پوری نام نہاد ملتِ اسلامی کا بھرم کھل گیا ہے ——— ابھی تک معاملہ صرف فلسطینی عربوں کے حقوق کا تھا ، جسے خود عربوں نے سخت نا عاقبت اندیشی سے کام لے کر اپنا ایک داخلی سا مسئلہ بنا رکھا تھا۔ لیکن اب معاملہ پوری ملتِ اسلامیہ کی دینی غیرت و حمیت کا ہے۔ اس ذلت کو اگر یہ پوری امت اس طرح گوارا کر گئی تو دشمن حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی حرمت پر وار کرنے سے کب باز رہے گا ! ——— آج کے دور میں جبکہ لاکھوں میل کے فاصلے کی بھی کوئی وقعت نہیں رہی ، اسرائیل کی موجودہ سرحدوں سے مسجد نبوی ؐ کا فاصلہ کل چھ سو میل ——— اور مسجد حرام کا فاصلہ قریباً آٹھ سو میل رہ گیا ہے ——— اور کم از کم حرم نبوی ؐ پر اپنے دعویٔ استحقاق کو تو اسرائیل نے کبھی مخفی بھی نہیں رکھا ! ——— ادھر قرآن حکیم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمان امتوں کو ان کی بد عملی و بد کرداری کی سزا ، ان کے مقامات مقدسہ کی اغیار کے ہاتھوں بے حرمتی کی صورت میں بھی دیتے ہیں۔ چنانچہ ماضی کی امت مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کو یہ سزا دو بار دی گئی :-

"فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۝"

(سورہ بنی اسرائیل ۔ آیت ۷)

پھر جب آیا دوسری وعید کا وقت (تو مسلط کیا تم پر لوگوں کو) تاکہ بگاڑ دیں وہ تمہارا حلیہ اور داخل ہوں مسجد میں اسی طرح جس طرح داخل ہوئے تھے اس میں پہلی بار اور تباہ کر دیں ہر چیز کو جس پر بھی بس چل جائے ! "

تو کیا اب ہماری سیہ کاریوں کی کالک حرمین شریفین کی مقدس پیشانیوں پر بھی مل جائے گی !! ——— عیاذاً باللہ ! عیاذاً باللہ !!

دوسری طرف بھارت میں مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلی گئی ——— اور تا حال یہ شغل جاری ہے !! یوں تو ہندی مسلمانوں پر ظلم و تشدد اور تعدّی و عدوان بھارت کی ہندو جاتی کا روز کا معمول ہے۔ لیکن احمد آباد

اور اس کے گرد و نواح میں تو ان دنوں بالکل ۱۹۴۷ء کی خونچکاں داستان دہرائی گئی اور بعینہٖ وہی نقشہ سامنے آ گیا کہ ؎ : ——— "ہو گیا مانند آب ارزاں مسلماں کا لہو !"

اللہ کی شان ہے کہ جو شہر خود احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی سے معنون ہو، اُس میں اُن ہی کے دین کے نام لیوا اس طرح بھیڑ بکریوں کے مانند ذبح ہو رہے ہیں اور پورا عالم اسلام ہے کہ "تک تک دیدم دم نہ کشیدم !" کا نقشہ پیش کر رہا ہے ——— درآنحالیکہ کتاب الٰہی پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ :

"وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝"

(سورہ نساء : آیت ۷۵)

اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم جنگ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں اور ان مغلوب و مقہور مردوں، عورتوں اور بچوں (کی دادرسی) کے لئے جو کہتے ہیں کہ : "اے ہمارے پروردگار ! ہمیں اس بستی سے نکال جس کے لوگ ظالم ہیں اور ہمارے لئے اپنی جانب سے کوئی حامی اور مددگار اٹھا !"

اس معاملے میں یوں تو اس عالم ارضی کی پوری امتِ مسلمہ کی ملی غیرت و حمیت کا مرثیہ کہنا چاہیئے ——— خصوصاً اس لئے کہ یہ ایک ناقابلِ انکار واقعہ ہے کہ برصغیر ہند و پاک کی ملت اسلامی نے ہمیشہ پورے عالم اسلامی کے رنج و غم کو اپنا دکھ درد شمار کیا اور تاریخ شاہد ہے کہ ہمیشہ صورت حال یہ رہی کہ جا ہے کبھی بلقان و ترکی پر برا وقت آیا ہو، چاہے طرابلس و شام پر ہندوستانی مسلمان بالکل اس طرح تڑپ اٹھتا رہا جیسے خود اس کے پہلو میں خنجر بھونکا گیا ہو ؎

"خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ !
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے !!"

لیکن اُدھر یہ عالم ہے کہ بھارت میں "حتّٰی كُلِّ عَامٍ مَرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ" مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلی جاتی ہے لیکن عالم اسلام ——— اور بات کہنے کی نہیں لیکن ع "خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے !" کے مصداق کہنی پڑتی ہے کہ خصوصاً عالم عرب کا حال یہ ہے کہ ان کی ہر حکومت بھارت کی نیاز مندی میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے اور اسے سر آنکھوں پر بٹھانے کے لئے ایک دوسرے سے زیادہ بے تاب نظر آتی ہے ——— ماضی میں پنڈت نہرو کو عین مملکت عربیہ سعودیہ میں حرمین شریفین کی خادم د

حافظ حکومت نے "رسول السلام" کے خطاب سے نوازا ——— اور اس موقع پر تو حد ہو گئی کہ عین اس وقت جبکہ بھارت کے ایک صوبائی دارالحکومت میں مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا اور گھاس پھونس کی طرح جلایا جا رہا تھا، زعمائے عرب، رباط کی مسلم سربراہ کانفرنس میں بھارت کی شرکت پر زور دے رہے تھے اور اس معاملے میں ان کی صفوں میں ایک غیر معمولی اتحاد و اتفاق نظر آ رہا تھا حتیٰ کہ اس مقام پر "رجعت پسند شاہ پرست" اور نام نہاد "ترقی پسند" سب یکجان نکلے تھے ؎

"ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے
خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے!"

عالمِ اسلام اور خصوصاً عالمِ عرب سے یہ گلہ شکوہ تو قدرے دور کی بات تھی، لیکن ملتِ اسلامیہ پاکستان کے لئے تو یہ واقعتاً ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ وہ جن کی قربانیوں کے طفیل آج نہ صرف یہ کہ آزادی کے سانس لے رہی ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ گلچھرے اڑا رہی ہے ان پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹتے دیکھ کر بھی یہ ٹس سے مس نہیں ہوتی ——— خدا کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں اور مکافاتِ عمل صرف عالمِ آخرت کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اقوام و ملل کے اجتماعی جرائم کا حساب تو اکثر و بیشتر یہیں چکا دیا جاتا ہے ——— ہمارے یہ لچھن اگر وہی رہے کہ جو اب ہیں اور ہم اسی طرح ہندوستان کے مسلمانوں کے خون کی سرخی کو شرابِ ارغوانی اور غازۂ چہرۂ نسوانی میں تبدیل کرتے رہے تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا ——— !!

کم از کم ایک بات بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ اگر ہم ہندی مسلمانوں پر ظلم و ستم کی اس پیہم یلغار کو اسی طرح خاموش تماشائی بنے دیکھتے رہے اور ہماری رگِ حمیت صرف اسی قدر جوش کھاتی رہی کہ ہر بار ظالموں کی اس منڈلی کی دہائی دی جاتی رہی جسے اقوامِ متحدہ کہا جاتا ہے تو رفتہ رفتہ ہماری حمیتِ قومی اور غیرتِ ملی کا جنازہ بالکل نکل جائے گا اور وہ وقت زیادہ دور نہیں جب صورت وہ ہو جائے گی کہ ع :

"کہ غیرت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے!"

پھر تاریخ کی یہ شہادت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس گھرانے سے غیرت رخصت ہو جاتی اس سے آزادی اور خود اختیاری کو بھی روانہ ہوتے دیر نہیں لگتی! اللہ تعالیٰ ہمیں اس انجامِ بد سے بچائے! آمین۔

اندرونِ ملک کے حالات کو دیکھئے تو مزید مایوس کن صورت حال نظر آتی ہے اور ع :

"تن ہمہ داغ داغ شد، پنبہ کجا کجا نہم!"

کا نقشہ دکھائی دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اوپر کا سارا گلہ شکوہ ہی بے بنیاد نظر آنے لگتا ہے اس لئے کہ یہ سارا

"استغاثہ" تو صرف "ملتِ اسلامیہ" کے نام مناسب ہو سکتا ہے اور یہاں یہ تصور ہی کم ہوتے ہوتے بالکل معدوم کے درجے کو پہنچ چکا ہے کہ ع :

"آں قدح بشکست و آں ساقی نماند!"

چنانچہ جس قسم کے نعرے آج سے پچیس تیس سال قبل عالمِ عرب میں لگے تھے یعنی "المصر للمصریین"! (مصر مصریوں کا ہے!) اسی قسم کے نعرے آج سرزمینِ پاک میں بلند ہو رہے ہیں۔

مشرقی پاکستان میں تو بنگالی قومیت کا راگ شروع ہی سے الاپا جا رہا تھا اب سندھ بھی "جئے سندھ!" کے نعروں سے گونج رہا ہے اور یہی حال بلوچستان اور سابق صوبہ سرحد کا ہے ——— وہاں پختونستان کا سٹنٹ تو قدیم تھا ہی، ایک نئی دو عملی یہ ایجاد ہوئی ہے کہ 'عظیم باپ' افغانستان میں بیٹھ کر آزاد پختونستان کے نعرے کو ہوا دے رہا ہے اور اس کی صلبی و معنوی ذریت پاکستان میں بیٹھ کر اس کی ایک دوسری نسبتاً کم قابلِ اعتراض تعبیر پیش کر رہی ہے ——— الغرض وہ نعرہ کہ ؎

"بتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
کہ ایرانی رہے باقی نہ تورانی نہ افغانی!!"

جو تحریکِ پاکستان کے دوران خوب زور شور سے بلند ہوا تھا ایران و افغانستان تک کیا پہنچتا خود پاکستان میں دم توڑ رہا ہے[1] پوری ارضِ پاک میں ایک خطۂ پنجاب ہے جو شاید اپنے اس مایۂ ناز سپوت کی لاج رکھنے

[1] اس موضوع پر اس بار محترمی پروفیسر مرزا محمد منور صاحب کا مقالہ شاملِ اشاعت کیا جا رہا ہے۔ موصوف نے اپنے مخصوص انداز میں موجودہ صورت حال کا تجزیہ بھی کیا ہے اور اس کا مرثیہ بھی کہا ہے ——— ان کے جذبات بہ حیثیت قابلِ قدر ہیں۔ خود ہم نے جولائی کے شمارے میں پاکستان کی اجتماعی زندگی کی جن الجھنوں اور پیچیدگیوں کا تذکرہ کیا تھا ان میں سے تیسری الجھن جو مضمون کی دوسری قسط میں بیان ہونی تھی، یہی ہے کہ پاکستان میں 'قومیت' کا ایک ہولناک خلا ہے جو کوئی آج پیدا نہیں ہوا بلکہ بالکل ابتدا سے چلا آ رہا ہے لیکن بعد میں ہم نے اس موضوع پر قلم اٹھانے سے اس لئے احتراز کیا کہ : ع "اس میں کچھ پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں!" سردست صرف اس اشارے پر اکتفا مناسب ہے کہ پاکستان قائم تو "ملت از وطن است!" کی پُر زور نفی اور "ملتِ اسلامی" کے تصور کے زوردار اثبات پر ہوا تھا، لیکن خود اس کے قائم کرنے والے نے پہلے ہی روز غیر مبہم الفاظ میں یہ کہہ کر کہ : "پاکستان میں نہ کوئی ہندو رہے گا نہ مسلمان، مذہبی اعتبار سے نہیں اس لئے کہ وہ تو ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے بلکہ سیاسی اعتبار سے …!" ملتِ اسلامی کے تصور کی نفی اور "وطنی قومیت" کا اثبات کر دیا تھا (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کو جسے دنیا علامہ اقبال کے نام سے جانتی ہے "رجوع الی الجاہلیت" کی اس وبا سے قدرے بچا ہوا ہے — لیکن تابہ کے! — اگر یہ ایک واقعی قانونِ فطرت ہے کہ "ہر عمل ایک ردِ عمل کو جنم دیتا ہے!" تو جلد یا بدیر یہاں بھی وہی صورت پیدا ہو کر رہے گی —!

ایسی صورت حال میں ہندی مسلمانوں کی داد رسی کی توقع کس سے ہو! — یہاں تو بنگالی مسلمان نے غیر بنگالی مسلمان کا خون بہانے سے دریغ نہ کیا۔ کوئٹے میں بار بار فسادات کی آگ بھڑکی اور سندھ کے متعدد شہروں میں غیر سندھی مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے کا باقاعدہ پروگرام بن چکا تھا — یہ تو بھلا ہو مارشل لا کا کہ بروقت نافذ ہو گیا ورنہ مغربی پاکستان بھی اس میدان میں مشرقی پاکستان کی ہمسری کا شرف حاصل کر لیتا۔

تشتت و انتشار کی اس گرم بازاری میں مزید اضافہ دائیں اور بائیں بازو کی قوتوں کی ایک دوسرے کے خلاف صف آرائی سے ہو گیا ہے۔ چنانچہ دونوں کیمپوں میں ایک دوسرے سے نفرت اور بیزاری بڑھتی جا رہی ہے اور اشتعال میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے حتیٰ کہ تشدد اور تصادم اور فیصلہ کن مقابلے کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور نوجوان ایک دوسرے پر پل پڑنے کے لئے پر تول رہے ہیں۔

(حاشیہ بقیہ صفحہ گذشتہ) چنانچہ اسی وقت سے ہمارے یہاں ملتِ اسلامی اور پاکستانی قومیت کے مابین ایک کھنچاؤ جاری ہے۔ اور یہ اسی کھنچاؤ کے ثمرات ہیں جو آج علاقائی و لسانی قومیتوں کے فروغ کی صورت میں ظاہر ہو رہے ہیں۔ اس لئے کہ نظریۂ ملت کو خود ہم نے منہدم کر دیا اور پاکستانی قومیت کا تصور ہمارے مزاج کے مناسب نہ تھا۔ چنانچہ ہماری اجتماعی زندگی میں وہ خلا پیدا ہوا جو درحقیقت مذکورہ بالا قومیتوں اور عصبیتوں سے پُر ہوا — چنانچہ اب شکایت ہو تو کس سے اور گلہ ہو تو کس کا! — ع "اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست!!"

اگرچہ یہ اندیشہ بھی شدید ہے کہ بات کہیں 'حدود' سے تجاوز نہ کر جائے، لیکن دردِ دل بالکل خاموش بھی نہیں رہنے دیتا۔ حیرت ہوتی ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی رح کے 'مبینہ' الفاظ پر تو ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا اور آج تک بھی ان کا قصور معاف نہیں ہوا حالانکہ جب انہوں نے اپنے بیان کی وضاحت فرمائی تو علامہ اقبال نے بھی اپنے اشعار سے رجوع کر لیا تھا۔ لیکن بانیٔ پاکستان کے اس نظریہ وطنیت پر تنقید کی جرأت کسی کو نہ ہوئی حتیٰ کہ علماء بھی منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہے ؎

دیکھ کعبے میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ!
بتکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ!!

رہی سہی کسر علمائے دیوبند کے دو متحارب گروہوں نے ایک دوسرے کے مقابل آ کر پوری کر دی ہے۔ ان کے مابین بغض حادثہ نہیں قدیم ہے۔ قیام پاکستان کے بعد کچھ عرصے تک ان کی صفوں میں اتحاد و اتفاق کے مظاہرے دیکھنے میں آتے تھے لیکن معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ "تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّىٰ" والا معاملہ تھا، چنانچہ جونہی دوبارہ اختلاف رونما ہوا فضا ایک دم سڑی گالیوں سے معمور ہو گئی — بنائے نزاع "سوشلزم" کو قرار دیا گیا ہے۔ درآنحالیکہ سرمایہ داری کے دونوں ہی گروہ یکساں مخالف ہیں۔ اور مزدوروں اور کسانوں کی "حالتِ زار" کا دونوں ہی کو برابر رنج و غم ہے۔ حتیٰ کہ معاشی عدل و اعتدال کے لئے فوری تدابیر میں بھی دونوں میں کوئی اختلاف نہیں — بایں ہمہ کفر کے فتوے عام ہو رہے ہیں اور "کانگرسی مولوی" کی گالی میں تو خیر کوئی مضائقہ ہی نہیں ع

"بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است"

عجیب طرفہ تماشا ہے کہ "اسلامی جمہوریت" کی اصطلاح تو سر آنکھوں پر لیکن "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح قطعاً ناجائز و حرام — پھر مزید یہ کہ جس شخص نے سب سے پہلے یہ اصطلاح استعمال کی یعنی محمد علی جناح مرحوم وہ تو سب کے نزدیک قائد اعظم اور رحمۃ اللہ علیہ لیکن اب جو بھی یہ لفظ منہ سے نکالے وہ کافر و مرتد۔ بحالیٔ جمہوریت کے لئے تو ہر کس و ناکس سے تعاون کو جائز ہی نہیں لازمی و ناگزیر قرار دیا جائے اور معاشی ناہمواریوں کو دور کرنے کی غرض سے کوئی مزدوروں سے اتحاد کرے تو گردن زدنی ٹھہرے! ؎

"خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری!"

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس تفرقہ و انتشار کا انجام کیا ہوگا — اور ہماری قومی و ملی زندگی کسی حادثے سے دوچار ہو گی۔ بظاہر احوال تو امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی!

ان حالات میں جس کسی سے جو کچھ بن آئے غنیمت سمجھنا چاہئے۔ فساد اتنا ہمہ گیر ہے کہ کسی بھی تدبیر کے صد فی صد کارگر ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ایک ہی صورت ممکن ہے کہ نتائج سے بالکل بے پروا ہو کر جس سے جو خدمت دین و مذہب اور ملک و ملت کی بن پڑے اسے کرتے رہنا چاہئے۔

ہمیں اللہ تعالیٰ نے اپنی حقیر سی مساعی کو خدمت قرآن کے لئے وقف کرنے کے فیصلے کی توفیق دی ہے۔ چنانچہ جیسے بھی بن آ رہا ہے ہم اپنی صلاحیتوں اور اوقات کی حقیر سی پونجی اسی کام میں صرف کئے جا رہے ہیں۔ ہم اس توفیق پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور اسی سے اخلاص کی بھیک مانگتے ہیں تا ہمارا یہ

عمل اس کی بارگاہ میں مقبول ہو۔

'حلقہ ہائے مطالعہ قرآن' کا کام بحمد اللہ باقاعدگی سے جاری ہے۔ اور اس میں اللہ کے فضل وکرم سے روز افزوں ترقی ہو رہی ہے۔ خصوصاً سمن آباد کا حلقہ نہایت کامیاب ہے۔ جہاں سو سے زائد مرد اور پچیس تیس عورتیں پابندی سے شرکت کر رہی ہیں۔ اس کے علاوہ کرشن نگر میں مسلسل تین روز بعد نماز عشاء درس قرآن کا سلسلہ جاری ہے اور یہاں بھی مجموعی اعتبار سے سو سوا سو افراد مستفید ہو رہے ہیں۔ جامعہ خضریٰ سمن آباد میں خطبہ جمعہ بھی درس قرآن ہی کی حیثیت رکھتا ہے۔ عربی کی تدریس کا سلسلہ اس کے علاوہ ہے اور اس کا گروپ بھی اب ترجمہ قرآن کے مرحلے تک پہنچ گیا ہے ——— الغرض اپنی ہمت سے بڑھ کر بوجھ اٹھانے کی جرأت کر لی تھی۔ یہ اسی کا فضل ہے کہ نبھ رہا ہے۔ فلہ الحمد والمنۃ۔

"دار الاشاعت الاسلامیہ" کا کام بھی بیگڑی کی چال ہی سہی بہرحال چل رہا ہے۔ اس دوران میں تین نئے کتابچوں کی اشاعت ہوئی، دو بسلسلہ اشاعت قرآن اکیڈمی یعنی ایک "قرآن اور پردہ" کے موضوع پر مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کا مقالہ اور دوسرے "قرآن اور امن عالم" کے عنوان سے راقم کی تحریر ——— ایک کتابچہ بعنوان "اقامت دین کے لئے انبیاء کرام کا طریق کار" مؤلفہ مولانا امین احسن اصلاحی اشاعت پذیر ہوا۔ خاص طور پر اس کی اشاعت بحالات موجودہ بڑے پیمانے پر ہونی چاہئیے۔ اس لئے اس کی عام قیمت تو اگرچہ پچاس پیسے فی نسخہ ہے لیکن جو حضرات اسے تقسیم عام کے لئے منگوائیں، انہیں بیس روپے سینکڑہ کے حساب سے ارسال کر دیا جائے گا (اس صورت میں ایک صد سے کم کی ترسیل نہیں ہوگی!)

'میثاق' گذشتہ ماہ شائع نہیں ہو سکا جس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔ مستقل خریداروں کو اس طرح جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی کے لئے یہ صورت اختیار کی جائے گی کہ ان کی خدمت میں ایک نسخہ 'اقامت دین کے لئے انبیاء کرام کا طریق کار' کا اور ایک نسخہ 'قرآن اور امن عالم' کا پیش کر دیا جائے گا۔ امید ہے کہ یہ صورت خریدار حضرات کو برضا ورغبت قبول ہوگی ——— !! پہلا پمفلٹ اشاعت ہذا کے ساتھ ملفوف ہے، دوسرا آئندہ شمارے کے ساتھ حاضر خدمت ہو جائے گا ——— !!

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

پروفیسر محمد منور

ملت اسلامیہ پاکستان

اور نظریات وارضیات کی کشمکش

کوئی پودا جب اپنے وطن سے جدا ہو کر کسی دوسری سرزمین میں پہنچتا ہے تو نئی آب و ہوا کی تاثیر اسے کسی اور انداز میں ڈھالنے لگتی ہے۔ ابن خلدون کے بقول صحرائی کھجور ہندوستان کے مرطوب ساحل پر پہنچ کر آہستہ آہستہ ناریل بن جاتی ہے۔

ابن خلدون کی یہ رائے انسانی پودے کے حق میں بھی صادق آتی ہے۔ برعظیم پاک بھارت میں آریاؤں کی آمد سے قبل جو لوگ آباد تھے وہ سانولے تھے، ناک چپٹی تھی۔ اہل تحقیق انہیں آسٹریلیا کے اصل باشندوں کا ہم جد قرار دیتے ہیں وہ سب کچھ دھرتی سے حاصل کرتے تھے لہذا بخلوص امتنانی دھرتی کو پوجتے تھے۔ اسی طرح گئو ماتا کے لطف و احسان کے باعث اس کے بھی بت بنا رکھے تھے۔ وَنڈر وٹ واز انڈیا (WONDER WHAT WAS INDIA) کے مصنف باشم (BASHAM) کے بقول موہن جوڈیرو کے کھنڈرات سے برآمد ہونے والی اشیا میں گائے بیل کے بت نمایاں ہیں۔

آریا جو باہر سے آئے وہ گوشت خوار تھے۔ انہی نے موہن جوڈیرو اور دیگر قدیم قبل آریا آبادیوں کو فنا کیا تھا۔ مگر یہاں بس جانے کے بعد وہ بھی آخر کار سبزی خوار بن گئے اور گائے کی پرستش کرنے لگے۔ پھر بقول ایچ جی ولز ڈھائی ہزار سے پندرہ سو سال قبل ایک ہم تہذیب معاشرہ وجود میں آیا جو موجودہ کراچی سے لے کر شملے تک ایک جیسا چلا گیا تھا یعنی آریائی اور قبل آریائی معاشرت میں کوئی فرق باقی نہ رہ گیا تھا۔

ارضی و فرشی جاذبے اپنی جانب کھینچتے ہیں ——— ارضیات کے بندھنوں سے فقط نظریات آزاد کرتے ہیں، بے نظریہ زندگی، نباتی و جمادی زندگی ہے۔ برگساں زندگی کی رو کو بان اور ہوائی سے تشبیہ دیتے ہیں۔ زمین اس ہوائی کو اپنی جانب کھینچتی ہے مگر اس کے اندر کا شعلہ درون بارود اسے اوپر لے جاتا ہے وہ ہوائی چھوٹتی ہے اور مزید اوپر کو جاتی ہے۔ مگر زمین کی طرف لوٹ آتا ہے۔ اوپر جانے والی ہوائی جب دم توڑ کر نیچے کو کھنچنے لگتی

ہے تو اس میں پھر دھماکہ پیدا ہوتا ہے اور نئی ہوائی نکلتی ہے جو مزید اوپر کو جاتی ہے۔ ملبہ پھر زمین کی طرف لوٹ آتا ہے۔ زندگی کی یہ رو اسی طرح جاری ہے۔

برگساں کے ہاں یہ ہوائی کی مثال قوموں پر بھی صادق آتی ہے۔ زندگی اقوام کو اپنا آلۂ کار بنائے رکھتی ہے اور اپنا قدم آگے کو بڑھاتی ہے۔ ایک قوم آگے بڑھتی ہے اور دوسری فنا ہو جاتی ہے تیسری عروج سے ہمکنار ہوتی ہے، چوتھی زوال سے ہم آغوش ہو کر اونگھنے لگتی ہے۔ قوموں کی یادوں کی روح نظری اور رہ جاتی شے ہے۔ اس لئے کہ مادی مفاد کے مقابلے میں روحانی اتحاد نسبتاً بہت زیادہ قوی ہوتا ہے۔ مادی مفاد میں اشتراک دیرپا نہیں ہوتا۔ باہمی حسد و عداوت اور رقابت و چشمک ابھر آتی ہے۔ قرآن حکیم میں آتا ہے لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّا اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ ـــــ اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، اگر تم دنیا بھری ہر شے خرچ کر دیتے جب بھی ان لوگوں کے دلوں کو جوڑ نہ سکتے تھے لیکن اللہ نے ان کے دل جوڑ دیئے۔

ظاہر ہے کہ خدا نے انہیں دین سے نوازا۔ وہ دین کی رسی کو پکڑ کر ایک صف اور ایک قطار بن گئے۔ انتشار نے جمعیت کی شکل اختیار کر لی۔ پھر جب تک یہ دین، فعال روح بنا رہا اتحاد باقی رہا۔ مقاصد بھی بلند رہے۔ جمعیت اور ارضیت کے جذبات دبے رہے۔ جب بھی یہ روح کمزور ہوئی وہ لوگ اپنے اصل کی طرف لوٹ گئے۔ یعنی یہ نظریہ جسم ملبہ تھا وہ دھرتی کی طرف کھنچ گیا۔ مادے کا مزاج انتشار ہے لہٰذا جب بھی دینی یا یوں کہئے کہ نظریے کی گرفت ڈھیلی ہوگی اور جسم یا مادہ ہی مراد رہ جائے گا انتشار در آئے گا، روح کی تعمیر اور مادے کی تقدیر اور یہ ـــــ برگساں کے بقول مادہ تھکی ہوئی زندگی کا نام ہے۔ چنانچہ قومیں بلندیوں سے بیزار ہو کر مقاومت سے دست کش ہو جاتی ہیں اور پھر خاک نشین ہو کر خاک میں مل جاتی ہیں۔

ہماری قوم ـــــ پاکستانی قوم ـــــ مختلف اراضی سے وابستہ ہے۔ رنگ نسل قریب نہیں، زبان ایک نہیں، اجداد و آبا ایک نہیں۔ بنگال، بلوچستان، سندھ، پنجاب، سرحد اور کشمیر میں مختلف نسلیں آباد ہیں، مختلف زبانیں مروج ہیں۔ یہ قومیں ایک ریاست میں ضرور آباد ہیں مگر یہ اپنے اپنے علاقوں میں نسلی، لسانی اور کسی حد تک تہذیبی اعتبار سے منفرد قومیں ہیں۔ ان کے مجموعے کو ہم ریاست ہونے کے باعث ایک قوم قرار دیا جا سکتا ہے مگر یہ مغربی نظریہ ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ ان مختلف اقوام کو جس چیز نے ایک قوم بنا رکھا ہے وہ دین ہے۔ روڈلف راکر (RUDOLPH ROCKER) اپنی کتاب نیشنلزم اینڈ کلچر (NATIONALISM & CULTURE) میں لکھتے ہیں، "بہت سے مواقع پر کسی ادبی نسبتی کا جوار یعانت جماعت کے گروہوں کو ایک قومیت میں ڈھالنے کا بڑا قومی عنصر بن جاتا ہے۔" ارنسٹ بارکر نے اپنی کتاب (NATIONAL CHARACTOR AND TH FACTOR IN ITS FORMATION)

میں اس دینی عنصر پر زور دیا ہے اور مثالاً یونان کا ذکر کر کے واضح کیا ہے کہ کس طرح یونانی کلیسا نے یونان کو قرون وسطیٰ میں تقویت دی، آغاز عصر میں امداد بخشی اور آخرکار اسے ایک خود مختار قوم بنا دیا۔"

پاکستان کے وجود میں آنے سے قبل برعظیم پاک بھارت کے مسلمان جو بھانت بھانت کی بولیاں بولتے تھے جن کے نسلی گروہ سینکڑوں اور ہزاروں تھے محض دین کے باعث ایک قوم بن کر غیر اقوام کے مقابل تنے رہے۔ یہ دینی اتحاد درحقیقت اصول اور نظریے کا اتحاد ہے۔ لہٰذا ہماری اصطلاح میں مسلم قوم قوم نہیں بلکہ ملت ہے۔ مغربی اصطلاح اس پر لاگو نہیں ہوتی۔ مغرب کا اصلی مزاج اصول اور نظریے سے کم اور ارض سے زیادہ قریب رہا ہے لہٰذا وہاں ملت کا تصور ابھر ہی نہیں پایا۔ یہی باعث ہے کہ اس کیفیت کے لئے ان کے پاس کوئی لفظ بھی نہیں۔ خالی نیشن (N…ION) سے ہمارا کام نہیں چلتا۔

برعظیم پاک بھارت کے مسلمانوں میں زیادہ تعداد ان کی تھی جو اسی سرزمین میں بسنے والے ہندوؤں کی اولاد تھے۔ باہر سے آنے والوں کی اولاد بھی کم نہ تھی۔ مگر مسلمان ہونے کے باعث دیسی اور غیر دیسی ایک قوم بن گئے یہاں کے اصل گاؤپرست مسلمان ہو کر گاؤ خوار بن گئے۔ بت پرست بت شکن ہو گئے۔ مغربی پاکستان کے علاقے افغانستان، ترکستان اور ایران کے ہمسائے ہیں۔ ان علاقوں کے باشندوں میں بیرونی نسلوں کا عمل دخل مشرقی پاکستان کے باشندوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ خاص طور پر ہلاکو اور چنگیزی یلغاروں نے اس علاقے میں بیرونی مسلمانوں کو بہت زیادہ تعداد میں پناہ گزین ہونے پر مجبور کر دیا تھا مگر بنگال کے مسلمانوں میں بیرونی عنصر کا اثر کم ہے۔ لہٰذا مغربی پاکستان میں بیرونی عنصر اور مقامی احوال کی کارفرمائی ہے اور بنگال میں بیشتر مقامی کوائف عمل پیرا ہیں اس لئے اگر نباتی و جمادی کشش کو سامنے رکھا جائے تو بنگال کا ارضیت کی طرف رجوع نسبتاً جلد ہونا چاہئے۔ لیکن نظریے اور جغرافیہ کسی متوازن تناسب سے نہیں بٹتے۔ ہو سکتا ہے کہ ارضیت سے قریب تر گروہ میں نظریے کی بجلی نسبتاً زیادہ شدت سے اثر انداز ہو۔ آخر یہی تو ہو سکتا ہے کہ ع

گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا

برعظیم پاک بھارت کے مسلم قوم سے زیادہ ملت پر بھروسہ کرتے رہے ہیں اور اس ضمن میں عربوں سے ہزاروں قدم آگے ہیں اس لئے کہ بعض تحریکات اور بعض خصوصی احوال نے اس برعظیم کے مسلمانوں میں دینی جذبے کو باقی ہر شے پر بالا رکھا۔

پھر اگر تجزیہ کریں تو ہماری قوم دنیا کی دیگر اقوام سے عام انسانی سطح پر تو مختلف نہیں۔ عام انسانی خوبیاں اور کمزوریاں جو مشترک سرمایہ ہیں ان میں بھی موجود ہیں۔ یہ بھی عام انسانی معاشروں کی طرح پست و بلند ہو سکتی ہے اس میں بھی ان کی طرح نظریے اور مادے کی کشمکش پائی جاتی ہے۔ لیکن چونکہ دوسرے مذاہب

کے مقابل اسلام ایک فعال نظریہ ہے اور شمول و احاطہ اس کا مزاج و قوام ہے۔ لہٰذا مسلم اقوام میں نظریے اور مادے کی کش مکش دیگر اقوام کے مقابل شدید تر ہے۔ مصر، ترکی، ایران، سعودی عرب، الجزائر سب اس کش مکش کو سختی سے محسوس کر رہے ہیں۔

مگر اس بین الاقوامی اور بین الاسلامی رنگ کے علاوہ ہمارے مخصوص جغرافیائی، اقتصادی اور سیاسی احوال بھی ہیں۔ دوسرے مسلم ممالک میں بسنے والی کوئی جمعیت ایسی نہیں کہ وہاں حاکم رہنے کے بعد کسی غیر کی محکوم یوں ہوئی ہو کہ اپنے سابق محکوم ابنائے وطن کی اکثریت میں ایک مسکین سی اقلیت بن کر رہ گئی ہو یہاں کے مسلمانوں کو برعظیم کے باہر سے آنے والے انگریزوں کا دباؤ بھی سہنا پڑا اور ابنائے وطن کا بھی ——— غیرمسلم اکثریت کے مزاج میں سابقہ ذلت کے انتقام کا ذوق اور اقلیت کے مزاج میں سابقہ شاہی کا نشہ۔ مسلمان جہاں حاکم ہو کر رہے وہاں محکوم ہونے کے بعد موت کی زندگی سے کبھی ہمکنار نہ ہوتے۔ سپین میں مسلمانوں کی اکثریت تھی محکوم ہوتے تو حاکم اقلیت نے انہیں مٹا دیا۔ باقی علاقوں میں جہاں وہ حاکم رہ کر اب محکوم بنے ہوتے ہیں ان کی بستی کہیں خاموش اور راضی برضا ہے اور کہیں اضطراب کا شکار۔ اس میں حاکم قوم کے رویے کا بھی دخل ہے۔ بھارت، روس، چین، حبشہ، لبنان، نائیجیریا وغیرہ ہر کہیں انداز عمل مختلف ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ مغربی پاکستان میں علم اسلام کا داخلہ مشرقی پاکستان سے قبل ہوا۔ لیکن محمد بن قاسمؒ کو بہت جلد واپس بلا لیا گیا اور مغربی پاکستان کے جنوبی اضلاع میں مسلمانوں کی سیادت رفتہ رفتہ تقریباً ختم ہو گئی اور مسلمان باشندوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ ازاں بعد غزنوی یلغار جس نے مغربی پاکستان کے بیشتر حصے کو غزنی کے ساتھ ملحق کر دیا تھا بمصداق صوفیا کی اُس یلغار سے جس نے بنگال کو اپنے افکار سے متاثر کرنا شروع کیا تھا پنجاب کا پال خاندان بنگال کے سین خاندان کا تقریباً معاصر تھا اس اعتبار سے دیکھیں تو مغربی پاکستان میں اسلام سیاسی قوت کے ساتھ آیا اور صوفیائے کرامؒ پیچھے پیچھے چلے آئے مگر مشرقی پاکستان میں صوفیا پہلے پہنچے، اور سیاسی قوت فاتحین اسلام کے جلو میں بعد ازاں وارد ہوئی۔ مشرقی پاکستان میں ہزارہا افراد بختیار خلجی کے حملے سے قبل حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے۔ بہرحال موجودہ مغربی پاکستان کا بیشتر حصہ مشرقی پاکستان سے کوئی پونے دو سو سال قبل اسلامی سلطنت کا حصہ بن چکا تھا۔ دہلی اور اجمیر کی فتح سے ایک سو ستر سال قبل لاہور غزنی کی سلطنت کے زیر نگیں رہا۔

مغربی پاکستان کا مزاج جغرافیائی اور نسلی اعتبار سے مشرقی پاکستان سے مختلف ہے۔ یہاں نسلی رابطہ قدیم اقوام ہند سے بھی ہے اور ایران و افغانستان اور ترکستان سے بھی۔ وہاں عصبانی اور نسل کا تعلق قدیم اقوام بنگال سے ہے۔ افغانی، ایرانی، ترکی اور عرب خاندان یہاں کے مقابل بہت کم ہیں۔ اردگرد بدھ مت اور

ہندومت کے پیرو ممالک ہیں۔ بھارت، نیپال، برما ——— آب و ہوا کا فرق اور آبادی کا تناسب ایک قوی عنصر ہے جو ایک حصے کو دوسرے سے متمیز کرتا ہے۔ وہاں کی بے پناہ آبادی خوراک کی کمیابی کے باعث نقل مکانی پر نسبتاً زیادہ مجبور ہے۔ پھر وہ اگر مغربی پاکستان کے لقموں کو بھی نگاہ میں رکھیں تو بالکل جائز اور سمجھ میں آنے والی بات ہے۔

مسلم بنگال اور مسلم پنجاب کا سیاسی زوال بھی تقریباً ساتھ ساتھ ہوا۔ وہاں اٹھارویں صدی کے نصف میں انگریز نے اڈہ ڈالا اور مکر و ظلم کا دور دورہ شروع ہوا۔ یہاں بھی اٹھارویں صدی کے نصف میں ایرانیوں، افغانوں اور سکھوں نے تباہی مچا دی اور آخر کار سکھ پنجاب کے بیشتر حصے پر باقاعدہ قابض ہو گئے۔ سکھوں نے پنجاب کے مسلمانوں کو وہ ذلیل کیا اور اس طرح پامال کیا کہ جب انگریز آئے تو انہوں نے ایک طرح سے سکھ کا سانس لینا شروع کیا۔ چنانچہ فرق ظاہر ہے۔ بنگال کے مسلمانوں کو جو شدید نفرت انگریز سے تھی پنجاب کے مسلمانوں کو نہ تھی۔ یوں تو سرحد کا صوبہ بھی سکھوں کے ماتحت تھا مگر ان علاقوں میں ظاہری سرداری میں کسی نہ کسی طریق سے مسلمان شریک رہے۔ علاوہ ازیں سکھوں کی عام وحشی آبادی جو بے لگام ہوتی اور غارت مچاتی پھرتی تھی وہ شمالی سرحدی علاقوں میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ صحیح معنوں میں یہ عذاب پنجاب ہی کے مسلمانوں کو سہنا پڑا تھا۔

برعظیم پاک ہند کے مسلمانوں کو ایک قوم ہونے کا احساس محکوم ہونے کے بعد ہوا ——— زوال نعمت ہی سے قدر نعمت واضح ہوتی ہے۔ جب اقتدار اور قوت چھن گئی تو اس کی بازیابی کے لئے شعوری اور غیر شعوری کوششوں نے ملت کے نظریے سے استمداد کی۔ اس کا اوّلین عملی اظہار سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک سے ہوا۔ ازاں بعد یہ تحریک درجہ بدرجہ رنگ بدلتی، پلیٹ فارم بدلتی، لیڈر بدلتی، طرز عمل بدلتی تحریک پاکستان بن گئی۔ مسلم اقلیت کے علاقوں نے تحریک پاکستان کے ضمن میں ووٹ سے وہی کام لیا جو سید احمد شہید بریلویؒ کی تحریک کے ضمن میں تیغ اور توپ سے لیا تھا۔

پاکستان کی کل آبادی کی کیفیت ایک ایسی کھچڑی کی طرح ہے جس کا ذائقہ اور مزاج متعین نہ کیا جا سکتا ہو۔ یہاں آریائی عناصر بھی موجود ہیں، آریائی طبقاتی تقسیم بھی موجود ہے۔ پرانی تہذیب کے آثار موہن جو ڈارو، ٹیکسلا اور ہینامتی کی شکل میں محفوظ ہیں اور اسلامی تہذیب بھی مسجدوں، قلعوں، مقبروں، مدرسوں، خانقاہوں اور کتب خانوں کی صورت میں جلوہ گر ہے۔ مخصوص جغرافیائی احوال پہلے بھی اثر انداز تھے اب بھی ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس برعظیم میں مسلمانوں کی سیادت کا مظہر سینکڑوں سال تک دربار حکومت رہا۔ ظاہر ہے کہ یہاں مسلمان تعداد کی رُو سے ہیچ مقدار تھے لہٰذا مجبور بھی تھے کہ درباری قوت پر انحصار کریں اور دربار ہی کو اپنی بقا کا ضامن جانیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس برعظیم کے مسلمانوں میں شاید شاہ پرستی اس وجہ سے بھی دوسرے مسلم ممالک کے مقابل کچھ زیادہ

بھی تھی ——— دوسرے مسلمان ممالک ایسی تکلیف دہ صورت حال سے دوچار نہ تھے۔ چنانچہ جب کاروبار دربار مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا تو وہ تیتر بتر ہو گئے۔ یہ بھی پیش نظر رہے کہ سلطنت کی حفاظت کے لئے مسلمانوں کو فوجی ملازمت میں رہنا پڑتا تھا۔ کبھی بغاوت کی سرکوبی، کبھی بیرونی حملے کی روک تھام، کبھی غیر محروسہ علاقوں کی تسخیر گویا مسلمان جو اقلیت میں تھے، سینکڑوں سال مسلسل قتل اور شہید بھی ہوتے رہے۔ اس برعظیم کی وسیع سلطنت میں شاید ہی کوئی سال ایسا آیا ہو جس میں بلا مبالغہ ہزاروں مسلمان کام نہ آتے ہوں ان کے مقابل ہندو رعایا بیشتر تجارت اور زراعت میں محو اور مقابلتاً چین سے بسر کر رہی تھی ؎ گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت تھا اور وہ خوب پھل پھول رہی تھی، آبادی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

ممکن ہے پاکستانی مسلمانوں کا ہر معاملے میں حکومت ہی پر تکیہ کرنا اور حکومت ہی سے رہبری کی خواہش کرنا سینکڑوں سال کے اس تاریخی کوائف ہی کا نتیجہ ہو۔ نیز ممکن ہے کہ مزاجوں میں جاگیرداری کا رچاؤ بھی اسی صدیا سالہ عمل کا اثر ہو۔

بنگال پر مسلمانوں کی آمد کے وقت بدھ مت کا اثر زیادہ تھا وہ ویسے بھی بدھ مت کے وطن کا ہمسایہ علاقہ تھا۔ مغربی پاکستان کے علاقوں میں مسلمانوں کے داخلے کے وقت جب بدھ مت کا قلع قمع ہو چکا تھا ہندو مت دوبارہ قوت پکڑ چکا تھا۔ لہٰذا یہاں کی ہندو آبادی سے مسلمان ہونے والوں اور وہاں کے بدھ آبادی کی مسلم اولاد کے مزاج میں قدرے فرق ہونا ضروری تھا۔ اب اگر اسلام کا رشتہ کمزور ہوگا تو اصولاً پھر یہ قوم باعث مادے کی طرف لوٹ جائے گی۔ مادہ پرستی آج کی دنیا کا فلسفہ مقبول ہے۔ ہر دور کی شدید ترین ضرورت کی ترجمان اصطلاحات کا نام فلسفہ رکھ لیجئے۔ مادہ پرستی کا اصل مفہوم دہریت ہے۔ دہریت اور دھرتی پوجا میں کوئی فاصلہ نہیں لہٰذا خطرہ ہے کہ بنگالی مسلمان سیکولر ہو کر مینا متی کی جانب لوٹ جائیں اور پنجاب سندھ وغیرہ کے مسلمان دین کی روح کمزور ہو جانے کے باعث موہن جوڈیرو اور ہڑپہ کے تقدس کا دم بھرنے لگیں، ایسے ہی جیسے مصر اہراموں اور فرعونوں کی جانب اور ایران تخت جمشید اور دخمۂ فریدوں کی طرف لوٹ جائے۔

آج ہماری قوم روح اور مادے کی شدید کشمکش میں مبتلا ہے۔ یوں تو یہ کشمکش ہمیشہ رہی ہے مگر اب عصری تقاضوں کے باعث اس کے اشتداد میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ نتیجۃً ہوس کی کارفرمائی بہت زیادہ ہے۔ ہوس کی کارفرمائی دیانت صداقت کو لے ڈوبتی ہے۔ رزق حلال کا تصور غائب ہو جاتا ہے، رشوت کی فراوانی، خویش پروری، قوم کے اجتماعی مفاد سے بے خبری بلکہ ذوق ہوس رانی کے باعث ملک اور قوم سے غداری پر آمادگی ——— یہ ایک پہلو ہے۔ دوسری طرف روحانی ورثہ ہے۔ الفقر فخری اور عملی مثال جو پیش نظر ہے وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ کی ہے۔ لہٰذا یہ قوم اپنے دینی اور سیاسی راہبروں کو جانچتے وقت

اور تنقید کرتے وقت معیار اتنا بلند کر دیتی ہے کہ کوئی بھی نظر میں نہیں جچتا۔ ہوس کی پستی، اصول کی بلندی، درمیان میں بیسویں صدی کا مشینی زاد قومی معاشرہ جو کہہ رہا ہے ؎ ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

قرآن کریم میں آتا ہے اِنّا خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ ثم رددناہ اسفل سافلین
پست ترین سطح تو انسان سے میسر آ سکتی ہے اس میں مسلمانوں کو خصوصیت حاصل نہیں۔ غداری بھی ہر قوم میں پائی جاتی ہے کاہلی اور ناکردہ کاری بھی۔ کہیں زیادہ کہیں کم۔ اور بلا اختصاص ہر وہ قوم جو زمانے کی رو کا مقابلہ اور محاسبہ نہیں کرتی زوال سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔ البتہ یہ خصوصیت مسلمانوں ہی کو حاصل ہے کہ جب ان کی روح بیدار ہو جائے تو کمال کر دکھاتی ہے۔ اس عالم میں ان کے اعمال معجزے نظر آنے لگتے ہیں۔ لیکن یہ قوم زیادہ دیر تک چوکس نہیں رہتی۔ غفلت کا دورہ بڑی جلدی پڑتا ہے۔ یہ عقائد کی سرسری بحث میں الجھ کر اپنی بغداد کو لٹوا اور کٹوا دیتی ہے۔ یہ مرغوں اور بٹیروں کی پالیوں میں تو مسلح ہو کر شریک ہوتی ہے اور واجد علی شاہ کے پاپوش زنجیر ہونے پر ہاتھ نہیں ہلاتی۔ یہ قوم عراق، شام، اردن اور مصر میں باہم دست و گریباں رہتی ہے۔ اور بیت المقدس یہودیوں کے قبضے میں چلا جاتا ہے۔

پاکستانی قوم یا ملت اسلامی ملت کا جزو ہے۔ ملت روح ہے۔ اس روح کو بیدار رکھنا لازم ہے۔ اسی کے باعث مقاومت کی صلاحیت ابھرے گی۔ خواہ وہ مقاومت اقتصادی میدان میں ہو خواہ علمی میدان میں اور خواہ عسکری میدان میں۔ اس روح کا اضمحلال جسے میں کاہل جانا اور لیں۔ جس کا مطلب ہے دھرتی پوجا اشتراکیت، موہن جوڈیرو، مینامتی ——— انتشار اور محکومی ——— معاذ اللہ

بقیہ: تقریظ و تنقید: صفحہ ۲۰ سے آگے

دیکھا ہے؟ میں تو تم سے بہت زیادہ اس کے ساتھ رہا ہوں لیکن میں نے اسے یہ سب کرتے نہیں دیکھا (البدایہ ۸/۲۳۳)

(۱۹) جب ۶۵ھ میں عبد الملک بن مروان خلیفہ ہوئے تو سب سے پہلے جن لوگوں نے ان کی بیعت کی انہیں حضرت زین العابدین علی بن حسینؓ بھی تھے۔ اسی لئے عبد الملک ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ (طبقات الکبریٰ ۵/۱۵۹۔ تابعین صفحہ ۲۰۳)

(۲۰) ولید بن عبد الملک کے عقد میں حضرت حسن مجتبیٰؓ کی دو پوتیاں تھیں۔ ایک سیدہ بنت حسن مثنیٰؒ اور دوسری نفیسہ بنت زیدؒ۔ حضرت حسنؓ کے یہ دونوں بیٹے (حسن مثنیٰ اور زید) کربلا سے صحیح و سالم واپس آئے تھے۔ ان دونوں کی دختروں کا واقعہ کربلا کے بعد بنو امیہ کے عقد میں آنا اس بات کا ثبوت ہے کہ بنو ہاشم اور بنو امیہ میں کسی قسم کی عداوت نہیں تھی۔

۳- کتاب النفس والروح

وشرح قواھما للامام فخر الدین رازی -
تحقیق ڈاکٹر محمد صغیر حسن صاحب المعصومی

ایم اے، پی ایچ ڈی - استاذ بالمعہد الاسلامیہ، اسلام آباد، پاکستان - شائع کردہ، اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، اسلام آباد، پاکستان - کاغذ ولایتی - سائز $\frac{۲۰\times۲۶}{۸}$، ۲۲۰ صفحات، طباعت بذریعہ ٹائپ -

ڈاکٹر معصومی صاحب جن کا نام غایت شہرت کی بنا پر محتاج تعارف نہیں ہے، تمام طالبانِ علم کی طرف سے مستحق تحسین ہیں کہ انہوں نے سرآمد متکلمین اسلام امام فخر الدین رازی کی نادر الوجود کتاب یعنی کتاب النفس والروح کو بڑی قابلیت کے ساتھ ایڈٹ کرکے شائع کیا - اس کتاب کا صرف ایک قلمی نسخہ بوڈلین لائبریری آکسفورڈ میں محفوظ ہے - ڈاکٹر صاحب نے مقدمے میں وعدہ فرمایا ہے کہ وہ عنقریب اس کا انگریزی ترجمہ بھی ادارے کی طرف سے شائع کریں گے -

ڈاکٹر صاحب کے بارے میں صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ وہ ۱۹۱۸ء میں سرزمین بہار میں پیدا ہوئے جو گوتم بودھ کے زمانے سے علم وفضل کا معدن اور منبع بنی ہوئی ہے - ڈھاکہ یونیورسٹی سے عربی میں ایم اے کیا پھر ۱۹۵۱ء آکسفورڈ گئے وہاں اندلس کے مشہور فلسفی ابن باجہ کی کتاب النفس کو ایڈٹ کیا (تعلیقات فائقہ شامل کتاب کیں) جس پر ڈاکٹریٹ ملی ڈھاکہ یونیورسٹی، سندھ یونیورسٹی اور جامعہ اسلامیہ بہاولپور میں علمی خدمات انجام دینے کے بعد اب ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد میں ڈپٹی ڈائریکٹر ہیں - ابن باجہ سے متعلق چار کتابیں شائع کر چکے ہیں -

امام رازی المتوفی ۶۰۶ھ یگانۂ روزگار ہستیوں میں سے تھے - ان کی تصانیف کا شمار دو سو کے قریب ہے - وہ تفسیر، لغت، ادب، منطق، فلسفہ، عقائد اور کلام میں بلاشبہ نادر الوجود تھے - کتاب النفس والروح کا تعلق علم الاخلاق (Ethics) سے ہے - اس کتاب میں انہوں نے حصۂ اول میں حسب ذیل امور سے بحث کی ہے - (۱) مرتبۂ انسان در مراتب موجودات (۲) ماہیتِ نفس (۳) کتب الٰہیہ سے دلائل (۴) قلب، جوہر نفس ہے (۵) شرح قوائے نفس (۶) نفس ناطقہ، (۷) لذات عقلیہ، لذات حسیہ سے اشرف ہیں -

دوسرے حصّے میں نفسانی امراض کا علاج تجویز کیا ہے - اس میں حسب ذیل مباحث رقم کئے (۱) فضل المال (۲) بذریعہ مال سعادت کا حصول (۳) امراض نفسی مثلاً حرص، بخل، جاہ، ریاء والسمعۃ ان کی تشریح کے بعد ان کے ازالے کی صورتیں تجویز کی ہیں - کتاب کی قیمت پندرہ روپے ہے اور ادارۂ تحقیقات سے مل سکتی ہے -

تدبر قرآن
مولانا امین احسن اصلاحی

تفسیر سورۂ انعام

(۹)

۱۹- آگے کا مضمون آیات ۱۱۸-۱۴۰

آگے اُن مشرکانہ بدعات کی تردید آرہی ہے جو مشرکین نے اختیار تو کی تھیں شیطان کے القا سے لیکن دعوے یہ کرتے تھے کہ یہ حضرت ابراہیمؑ سے ان کو وراثت میں ملی ہیں - قرآن نے ان بدعات کو بے سند اور بے بنیاد قرار دے کر ان کے تحت حرام کردہ چیزیں جائز قرار دے دیں تو انہوں نے یہ ہنگامہ کھڑا کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے وہ چیزیں بھی جائز کر دی ہیں جو ہمارے بزرگوں - ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ - کے زمانے سے حرام چلی آرہی تھیں یہ پروپیگنڈا قدرتی طور پر کمزور طبائع پر اثر انداز ہوا - ہم بقرہ کی تفسیر میں آیات ۱۶۸-۱۷۲ کے تحت تفصیل سے بیان کر آئے ہیں کہ کھانے پینے کی چیزوں کے معاملے میں اول تو طبیعتیں یوں ہی بڑی حساس ہوتی ہیں اور اگر ان کا تعلق مشرکانہ مذہبی روایات سے ہو تو یہ حس تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے اسی وجہ سے قرآن نے یہاں بڑی تفصیل کے ساتھ ان توہمات کی تردید بھی فرمائی اور اصل ملت ابراہیمؑ کی وضاحت بھی فرمائی - یہ مضمون سورہ کے آخر تک چلا جائے گا - بیچ بیچ میں بعض باتیں بطور التفات یا کسی ذیلی شبہہ کی تردید و توضیح کے طور پر بھی آئی ہیں لیکن سب بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی بحث سے تعلق رکھنے والی ہیں - ان کا موقع و محل سلسلۂ بیان سے خود واضح ہو جائے گا - اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے -

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ۝
وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ

عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ ۗ وَإِنَّ كَثِيرًا لَّيُضِلُّونَ بِأَهْوَائِهِم
بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِينَ ﴿١١٩﴾ وَذَرُوا ظَاهِرَ
الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَكْسِبُونَ الْإِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوا
يَقْتَرِفُونَ ﴿١٢٠﴾ وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ
لَفِسْقٌ ۗ وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ لِيُجَادِلُوكُمْ ۖ
وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ ﴿١٢١﴾ أَوَمَن كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ
وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَن مَّثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ
لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ۚ كَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكَافِرِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٢٢﴾ وَكَذَٰلِكَ
جَعَلْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ أَكَابِرَ مُجْرِمِيهَا لِيَمْكُرُوا فِيهَا ۖ وَمَا يَمْكُرُونَ
إِلَّا بِأَنفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ﴿١٢٣﴾ وَإِذَا جَاءَتْهُمْ آيَةٌ قَالُوا لَن
نُّؤْمِنَ حَتَّىٰ نُؤْتَىٰ مِثْلَ مَا أُوتِيَ رُسُلُ اللَّهِ ۘ اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ
يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ ۗ سَيُصِيبُ الَّذِينَ أَجْرَمُوا صَغَارٌ عِندَ اللَّهِ وَ
عَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا كَانُوا يَمْكُرُونَ ﴿١٢٤﴾ فَمَن يُرِدِ اللَّهُ أَن يَهْدِيَهُ
يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ ۖ وَمَن يُرِدْ أَن يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ
ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ ۚ كَذَٰلِكَ يَجْعَلُ اللَّهُ
الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٢٥﴾ وَهَٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيمًا ۗ
قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَذَّكَّرُونَ ﴿١٢٦﴾ لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ عِندَ
رَبِّهِمْ ۖ وَهُوَ وَلِيُّهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٢٧﴾ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا
يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُم مِّنَ الْإِنسِ ۖ وَقَالَ أَوْلِيَاؤُهُم
مِّنَ الْإِنسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَبَلَغْنَا أَجَلَنَا الَّذِي أَجَّلْتَ
لَنَا ۚ قَالَ النَّارُ مَثْوَاكُمْ خَالِدِينَ فِيهَا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۗ إِنَّ رَبَّكَ
حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿١٢٨﴾ وَكَذَٰلِكَ نُوَلِّي بَعْضَ الظَّالِمِينَ بَعْضًا بِمَا كَانُوا
يَكْسِبُونَ ﴿١٢٩﴾ يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَقُصُّونَ
عَلَيْكُمْ آيَاتِي وَيُنذِرُونَكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا ۚ قَالُوا شَهِدْنَا
عَلَىٰ أَنفُسِنَا ۖ وَغَرَّتْهُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَنَّهُمْ

كَانُوا كَافِرِينَ ﴿١٣٠﴾ ذَٰلِكَ أَن لَّمْ يَكُن رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَ
أَهْلُهَا غَافِلُونَ ﴿١٣١﴾ وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوا ۚ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ
عَمَّا يَعْمَلُونَ ﴿١٣٢﴾ وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۚ إِن يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ
وَيَسْتَخْلِفْ مِن بَعْدِكُم مَّا يَشَاءُ كَمَا أَنشَأَكُم مِّن ذُرِّيَّةِ
قَوْمٍ آخَرِينَ ﴿١٣٣﴾ إِنَّ مَا تُوعَدُونَ لَآتٍ ۖ وَمَا أَنتُم بِمُعْجِزِينَ ﴿١٣٤﴾
قُلْ يَا قَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ مَن
تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۗ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ﴿١٣٥﴾ وَجَعَلُوا
لِلَّهِ مِمَّا ذَرَأَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْأَنْعَامِ نَصِيبًا فَقَالُوا هَٰذَا لِلَّهِ
بِزَعْمِهِمْ وَهَٰذَا لِشُرَكَائِنَا ۖ فَمَا كَانَ لِشُرَكَائِهِمْ فَلَا يَصِلُ
إِلَى اللَّهِ ۖ وَمَا كَانَ لِلَّهِ فَهُوَ يَصِلُ إِلَىٰ شُرَكَائِهِمْ ۗ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ١٣٦
وَكَذَٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ قَتْلَ أَوْلَادِهِمْ شُرَكَاؤُهُمْ
لِيُرْدُوهُمْ وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ ۖ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا فَعَلُوهُ ۖ
فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ ﴿١٣٧﴾ وَقَالُوا هَٰذِهِ أَنْعَامٌ وَحَرْثٌ حِجْرٌ لَّا
يَطْعَمُهَا إِلَّا مَن نَّشَاءُ بِزَعْمِهِمْ وَأَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُورُهَا وَأَنْعَامٌ
لَّا يَذْكُرُونَ اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا افْتِرَاءً عَلَيْهِ ۚ سَيَجْزِيهِم بِمَا كَانُوا
يَفْتَرُونَ ﴿١٣٨﴾ وَقَالُوا مَا فِي بُطُونِ هَٰذِهِ الْأَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُورِنَا
وَمُحَرَّمٌ عَلَىٰ أَزْوَاجِنَا ۖ وَإِن يَكُن مَّيْتَةً فَهُمْ فِيهِ شُرَكَاءُ ۚ سَيَجْزِيهِمْ
وَصْفَهُمْ ۚ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿١٣٩﴾ قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ قَتَلُوا أَوْلَادَهُمْ
سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَحَرَّمُوا مَا رَزَقَهُمُ اللَّهُ افْتِرَاءً عَلَى اللَّهِ ۚ قَدْ
ضَلُّوا وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿١٤٠﴾

ترجمہ

پس تم کھاؤ ان چیزوں میں سے جن پر خدا کا نام لیا گیا ہو، اگر تم اس کی آیات پر ایمان رکھنے والے ہو۔ اور تم کیوں نہ کھاؤ ان چیزوں میں سے جن پر خدا کا نام لیا گیا ہو جبکہ اس نے تفصیل سے بیان کر دی ہیں وہ چیزیں جو تم پر حرام ٹھہرائی ہیں اس استثنا کے ساتھ جس کے لیے تم مجبور ہو جاؤ۔ اور بے شک بہتیرے ایسے ہی ہیں جو لوگوں کو کسی علم کے بغیر اپنی بدعات کے ذریعے سے گمراہ کر رہے ہیں۔ تیرا رب خوب واقف ہے

ان حد سے بڑھنے والوں سے ۔ اور چھوڑو گناہ کے ظاہر کو بھی اور اس کے باطن کو بھی ۔ بے شک جو لوگ گناہ کما رہے ہیں وہ عنقریب اپنی اس کمائی کا بدلہ پا جائیں گے ۔ اور تم نہ کھاؤ ان چیزوں میں سے جن پر خدا کا نام نہ لیا گیا ہو ۔ بے شک یہ حکم عدولی ہے ۔ اور شیاطین القا کر رہے ہیں اپنے ایجنٹوں کو تاکہ وہ تم سے جھگڑیں اور اگر تم ان کا کہنا مانو گے ، تم بھی مشرک ہو جاؤ گے ۔ ۱۱۸ - ۱۲۱

کیا وہ جو مردہ تھا تو ہم نے اس کو زندہ کر دیا اور ہم نے اس کو ایک روشنی بخشی جس کو لے کر وہ لوگوں میں چلتا ہے اس کے مانند ہو گا جو تاریکیوں میں پڑا ہوا ہے ان سے نکلنے والا نہیں ہے ؟ اسی طرح کافروں کی نظر میں ان کے اعمال کھبا دیئے گئے ہیں ۔ اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے سرغنوں کو ڈھیل دی کہ اس میں اپنی چالیں چل لیں ۔ اور چال وہ اپنے ہی ساتھ چلتے تھے لیکن ان کو اس کا احساس نہیں تھا ۔ اور جب ان کے پاس آتی کوئی آیت تو کہتے ہم تو ماننے کے نہیں جب تک ہم کو بھی وہی کچھ نہ ملے جو اللہ کے رسولوں کو ملا ۔ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ وہ اپنا منصب رسالت کس کو بخشے ۔ جو لوگ شرارت کر رہے ہیں اللہ کے ہاں ان کو ان کی اس چالبازی کی پاداش میں ذلت اور عذاب شدید نصیب ہو گا ۔ اللہ جس کسی کو ہدایت دینا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جس کو گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کے سینہ کو بالکل تنگ کر دیتا ہے گویا اسے آسمان میں چڑھنا پڑ رہا ہے ۔ اسی طرح اللہ ناپاکی مسلط کر دیتا ہے ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے ۔ اور یہ تیرے رب کی راہ ہے سیدھی ۔ ہم نے اپنی آیتیں تفصیل سے بیان کر دی ہیں ان لوگوں کے لیے جو یاد دہانی حاصل کریں ۔ ان کے لیے ان کے رب کے پاس سکھ کا گھر ہے اور وہ ان کا کارساز ہے ان کے اعمال کے صلے میں ۔ ۱۲۱ - ۱۲۷

اور اس دن کا دھیان کرو جس دن وہ ان سب کو اکٹھا کرے گا ۔ کہے گا اے جنوں کے گروہ تم نے تو انسانوں میں سے بہتوں کو اپنا لیا ۔ اور انسانوں میں سے ان کے ساتھی کہیں گے اے ہمارے رب ہم نے ایک دوسرے کو استعمال کیا اور ہم پہنچ گئے اپنی اس مدت کو جو تو نے ہمارے لیے ٹھہرائی ۔ فرمائے گا تمہارا ٹھکانا اب جہنم ہے ہمیشہ کے لیے اس میں رہو مگر جو اللہ چاہے ۔ بے شک تیرا رب حکیم و علیم ہے ۔ اور اسی طرح ہم مسلط کر دیتے ہیں ظالموں کو ایک دوسرے پر بسبب ان کی کرتوتوں کے ۔ اے جنوں اور انسانوں کے گروہ کیا تمہارے

پاس تمہیں میں سے رسول نہیں آئے ، تمہیں میری آیتیں سناتے اور تمہارے اس دن کی ملاقات سے تم کو ہوشیار کرتے ہوئے ۔ وہ بولیں گے ہم خود اپنے خلاف شاہد ہیں اور ان کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں رکھا اور وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ بے شک وہ کافر رہے ۔ یہ اس وجہ سے کہ تیرا رب بستیوں کو ان کے ظلم کی پاداش میں اس حال میں ہلاک کرنے والا نہیں ہے کہ ان کے باشندے بے خبر ہوں ۔ اور ہر ایک کے لئے درجے ہیں ان کے عمل کے اعتبار سے اور تیرا رب اس چیز سے بے خبر نہیں ہے جو وہ کرتے رہے ہیں ۔ اور تیرا رب بے نیاز ، رحمت والا ہے ۔ اگر وہ چاہے تم کو فنا کر دے اور تمہارے بعد تمہاری جگہ جس کو چاہے لائے جس طرح اس نے تم کو پیدا کیا دوسروں کی نسل سے ۔ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ آ کے رہے گی اور تم ہمارے قابو سے باہر نہیں جا سکتے ۔ کہہ دو ، اے میری قوم ، تم اپنے طریقے پر چلو ، میں اپنے طریقے پر چلتا ہوں ، تم جلد جان لو گے کہ انجام کار کی کامیابی کس کا حصہ ہے ۔ یقیناً ظالم فلاح پانے والے نہیں ہو سکتے ۔ ۱۲۸ - ۱۳۵

اور خدا نے جو کھیتی اور چوپائے پیدا کیے ہیں اس میں انہوں نے اللہ کا ایک حصہ مقرر کیا ہے ۔ پس کہتے ہیں یہ حصہ تو اللہ کا ہے ان کے گمان کے مطابق اور یہ حصہ ہمارے شرکا کا ہے ۔ تو جو حصہ ان کے شرکا کا ہوتا ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچ سکتا اور جو حصہ اللہ کا ہوتا ہے وہ ان کے شرکا کو پہنچ سکتا ۔ کیا ہی برا فیصلہ ہے جو یہ کرتے ہیں ۔ اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کی نظر میں ان کے شرکا نے ان کی اولاد کے قتل کو ایک مستحسن فعل بنا دیا ہے تاکہ ان کو تباہ کریں اور تاکہ ان کے دین کو ان کے لئے بالکل گھپلا کر دیں ۔ اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کر پاتے تو ان کو چھوڑو اپنے اسی افترا میں پڑے رہیں ۔ اور کہتے ہیں فلاں فلاں چوپائے اور فلاں فلاں کھیتی ممنوع ہے ۔ ان کو نہیں کھا سکتے مگر وہی جن کو ہم چاہیں ، اپنے گمان کے مطابق ، اور کچھ چوپائے ہیں جن پر خدا کا نام نہیں لیتے ۔ محض اللہ پر افترا کے طور پر ۔ اللہ عنقریب ان کو اس افترا کا بدلہ دے گا ۔ اور کہتے ہیں فلاں قسم کے چوپایوں کے پیٹ میں جو ہے وہ بس ہمارے مردوں کے لیے خاص ہے اور ہماری عورتوں کے لیے حرام ہے ۔ اور اگر وہ مردہ ہو تو اس میں سب شریک ہیں ۔ عنقریب اللہ ان کو ان کی اس تخصیص کی سزا دے گا ۔ بے شک وہ حکیم و علیم ہے ۔ وہ لوگ نامراد ہوئے جنہوں نے محض بیوقوفی سے ، بغیر کسی علم کے اپنی اولاد کو قتل کیا اور اللہ نے ان کو جو روزی بخشی اس کو اللہ پر افترا کر کے حرام ٹھہرایا ۔ یہ گمراہ

ہونے اور ہدایت پانے والے نہ بنتے۔ ۱۳۷ - ۱۴۰

۲۰۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ۝ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ۝ وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ ۝

ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ جب اسلام نے وہ تمام چوپائے حلال و طیب قرار دے دیئے جن کو مشرکین نے اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت حرام قرار دے رکھا تھا تو اس کے خلاف انہوں نے بڑا ہنگامہ اٹھایا کہ یہ دیکھو، اس شخص نے اپنے پیروؤں کے لئے وہ چیزیں بھی جائز کر دی ہیں جو ہمارے بزرگوں — ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ — کے زمانے سے حرام چلی آ رہی تھیں۔ اس طرح کے معاملات میں، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، عام ذہن بڑا حساس اور ضعیف الاعتقاد ہوتا ہے اس وجہ سے مخالفانہ پروپیگنڈے کا اثر آسانی سے قبول کر لیتا ہے۔ قرآن نے یہاں اسی اثر کو دور کرنے کے لئے فرمایا کہ حرام وہی چیزیں ہیں جو اللہ نے اپنی کتاب میں تفصیل سے بیان کر دی ہیں پس ان مشرکین کی تحریم و تحلیل کی کوئی پروا نہ کرو۔ جو چیزیں شریعت الٰہی میں حلال ہیں ان کے باب میں اس کے سوا کوئی قید نہیں کہ بوقت ذبح ان پر خدا کا نام لیا جائے۔ اگر خدا کا نام لیا گیا ہے تو ان کو بے تکلف کھاؤ اور ان مشرکین کے پروپیگنڈے کو کوئی اہمیت نہ دو۔

'ان کنتم بآیاتہ مومنین' (اگر تم اللہ کی آیات پر ایمان رکھنے والے ہو) تاکید اور تنبیہ بلکہ ایک قسم کی تہدید بھی ہے۔ یعنی اللہ کی آیات پر ایمان کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ خدا کے احکام کے مقابل میں مشرکوں کے بے بنیاد پروپیگنڈے کی کوئی پروا نہ کرو۔ تحریم و تحلیل کا اختیار صرف اللہ کو حاصل ہے۔ اگر کسی اور کے لیے بھی یہ حق تسلیم کر لیا جائے تو یہ خدا کے حقوق میں دوسرے کو حصہ دار بنانا ہے اور یہ شرک ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ مسئلہ صرف ایک چیز کے کھانے اور نہ کھانے کا نہیں ہے بلکہ جن چیزوں کو مشرکانہ توہمات کی بنا پر حرام ٹھہرایا گیا ہے اللہ کی طرف سے ان کی حلت کے اعلان کے باوجود ان سے اجتناب کرنا گویا بالواسطہ شرک کو تسلیم کرنا ہوا اس وجہ سے یہ مسئلہ کفر و ایمان کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ توحید کا تقاضا

جیسا کہ آگے آ رہا ہے، یہ ہے کہ آدمی شرک ظاہر اور شرک باطن دونوں سے اپنے آپ کو پاک رکھے۔

'وما لکم الا تاکلوا مما ذکر اسم اللہ علیہ وقد فصل لکم ما حرم علیکم الا ما اضطررتم الیہ' مطلب یہ ہے کہ یہ خدا کی طرف سے وضاحت ہو چکی کہ حرام کیا کیا چیزیں ہیں تو اب خدا پر ایمان کا دعویٰ رکھنے والوں کے لیے اس معاملے میں تذبذب کی کیا گنجائش رہ گئی؟ 'تفصیل' سے یہاں اشارہ اس تفصیل کی طرف بھی ہے جو اس سے پہلے کی سورتوں میں گزر چکی ہے مثلاً سورہ نحل کی آیات ۱۱۴-۱۱۶ میں اور اس تفصیل کی طرف بھی ہے جو خود اس سورہ میں بیان ہوئی ہے۔ ہر چند یہاں زیر بحث مشرکانہ توہمات و عقائد کے تحت کسی چیز کو حرام سمجھنا ہے، نہ کہ مجرد ذوقی بنیاد پر کسی چیز سے احتراز۔ لیکن اس تاکید کے ساتھ جو جائز چیزوں کے کھانے پر زور دیا جا رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ شرک و توحید کا معاملہ دین میں اتنا اہم ہے کہ اس باب میں شریعت کسی ادنیٰ التباس کی بھی روادار نہیں ہے۔ اگر ذرا بھی اس میں مسامحت برتی جاتی تو یہ بہتوں کے اندر نفاق کی پرورش کے لئے ایک پردہ فراہم کر دیتی۔ یہ تاکید گویا ایک مخلص و منافق کے درمیان امتیاز کی ایک کسوٹی کے طور پر تھی۔ جو لوگ اس تاکید کے بعد بھی ان چیزوں کے کھانے سے محترز رہتے جن سے اب تک محترز رہے تھے تو ان کا یہ احتراز ان کے اندر شرک و جاہلیت کے جراثیم کی موجودگی کی شہادت دیتا۔ انبیاء و مصلحین کے طریقہ کار میں اس فرق و امتیاز کی بنیادی اہمیت ہے اور عقل و فطرت کا تقاضا بھی یہی ہے۔

'الا ما اضطررتم الیہ' میں اس استثنا کا بیان ہے جو حرام چیزوں کی ممانعت کے اندر اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے۔ حرام چیزیں بھی اس حالت میں انسان کے لئے جائز ہو جاتی ہیں جب اس کو حالتِ اضطرار پیش آ جائے۔ اس حالت اضطرار کی حدود و شرائط پر دوسرے مقام میں تفصیل سے ہم بحث کر چکے ہیں۔ یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ مشرکین اللہ کی حرام ٹھہرائی ہوئی چیزیں تو بے دھڑک بغیر کسی اضطرار کے بھی کھاتے تھے لیکن اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت جو چیزیں انہوں نے حرام قرار دے لی تھیں ان کو کسی حالت میں بھی ہاتھ نہیں لگاتے تھے، خواہ ان کی جان ہی پر کیوں نہ آ بنی ہو۔

'وان کثیرا لیضلون باھوائھم بغیر علم' 'اھواء' کے لفظ پر ہم دوسری جگہ بحث کر چکے ہیں کہ یوں تو اس کے معنی خواہشات کے ہیں لیکن جس سیاق میں یہ یہاں ہے اس سیاق میں اس سے مراد بدعتیں ہوتی ہیں اس لئے کہ بدعتوں کی بنیاد تمام تر ظن و گمان اور خواہشوں پر ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں کی تحریم یہ منسوب تو خدا کی طرف کرتے ہیں لیکن یہ تمام تر ان کی اپنی بدعات ہیں۔ خدا سے اس چیز کو کوئی تعلق نہیں۔ اس باب میں ان کے پاس خدا کی طرف سے کوئی ثبوت یا سند نہیں ہے، جس

کہ وہ پیش کر سکیں۔ 'کثیرا' کے لفظ میں جو پہلو ملحوظ ہے اس کی طرف اوپر آیت ۱۱۶ میں اشارہ گزر چکا ہے۔ قرآن نے یہاں ان کے اس عمل کو 'بغیر علم' جو قرار دیا ہے تو یہ ایک چیلنج بھی ہے کہ اگر ان کے پاس کوئی سند یا ثبوت ہے تو اس کو پیش کریں۔ دوسری طرف یہ ان سادہ لوحوں کی غلط فہمی کا ازالہ بھی ہے جو ہمیشہ اپنے بڑوں کی غلط سے غلط بات بھی اس حسن ظن پر مانتے رہتے ہیں کہ ان کے پاس ضرور اس بات کی کوئی نہایت مضبوط دلیل ہوگی، اگرچہ ہم اس سے واقف نہیں ہیں۔

'ان ربک ھو اعلم بالمعتدین': اوپر آیت ۱۱۷ میں فرمایا ہے وھو اعلم بالمھتدین، یہ ٹکڑا بالکل اس کے مقابل میں ہے۔ وہ تسلی کے لئے وارد ہوا ہے، یہ تہدید کے لئے۔

شرک اور مظاہر شرک دونوں کا استیصال

'وذروا ظاھر الاثم وباطنہ' یہ اوپر والی بات ہی کی تاکید ایک اور لطیف و دقیق پہلو سے ہے۔ ہر برائی کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک اس کا باطنی پہلو، دوسرا اس کا ظاہری پہلو۔ اس بات کو دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک تو اس کی حقیقت ہوتی ہے جس کا مسکن انسان کا نفس اور اس کا دل ہوتا ہے، دوسرے اس کے وہ مظاہر و اشکال ہوتے ہیں جن میں انسانی زندگی کے اندر وہ نمایاں ہوتی ہے۔ مثلاً شرک کی ایک تو حقیقت ہے جو یہ ہے کہ خدا کی ذات یا صفات یا اس کے حقوق میں کسی کو شریک ماننا، دوسرے اس کے مظاہر و اشکال ہیں مثلاً اصنام، انصاب، ازلام، بحیرہ، سائبہ، وصیلہ، حام اور اس نوع کی دوسری چیزیں جو کسی مشرکیہ عقیدے یا تصور کا عملی مظہر اور نشان ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں میں بڑا گہرا ربط ہوتا ہے۔ یہ ایک دوسرے کے سہارے سے پروان چڑھتی اور غذا و قوت حاصل کرتی ہیں اس وجہ سے اگر کسی برائی کا استیصال مقصود ہو تو یہ ضروری ہوگا کہ اس برائی کی حقیقت اور اس کے مظاہر و اشکال دونوں کا استیصال کیا جائے۔ اس کے بغیر اس کا استیصال ناممکن ہے۔ اگر یہ خیال کر کے اشکال و مظاہر سے چشم پوشی برتی جائے کہ جب اصل برائی پر ضرب لگا دی گئی تو اشکال و مظاہر میں کیا رکھا ہوا ہے تو وہ برائی انہی اشکال میں پھر اپنا نشیمن بنا کر اس میں اپنے انڈوں بچوں کی پرورش شروع کر دیتی ہے اور آہستہ آہستہ اس کا پورا کنبہ از سر نو آباد ہو جاتا ہے۔

یہاں زیر بحث آیت میں اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جس طرح شرک کو چھوڑنا ضروری ہے، اسی طرح مشرکیہ عقائد و تصورات کی بنا پر جن چیزوں کو مقدس مان کر حرام ٹھہرایا گیا ہے ان کے تقدس اور ان کی حرمت کو بھی ختم کرو اور عام جانوروں کی طرح ان کو بھی خدا کے نام پر ذبح کرو اور بے تکلف ان سے فائدہ اٹھاؤ۔ اگر ان کے باب میں کوئی جھجک طبیعت میں باقی رہتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ

ابھی شرک کی جڑ دل کے اندر باقی ہے۔ اگر جڑ باقی نہیں ہے تو آخر یہ اس کی شاخوں کو غذا کہاں سے مل رہی ہے؟ اس حقیقت کی طرف آگے بھی اسی سورہ میں یوں توجہ دلائی ہے: 'وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ' ۱۵۱ - انعام (اور بے حیائی کی باتوں کے قریب نہ پھٹکو، خواہ ظاہری ہوں یا باطنی) اسی اصول کے تحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد شرک کے تمام آثار و مظاہر کا یک قلم خاتمہ کر دیا۔ زیر بحث آیت میں لفظ 'اثم' اگرچہ عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ یہاں مراد شرک ہی ہے۔

خیر اور مظاہر خیر دونوں کی نگہداشت

یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ جو حال برائیوں کا مذکور ہوا بعینہ وہی حال بھلائیوں کا بھی ہے۔ ان میں سے بھی ہر ایک کی ایک تو حقیقت ہوتی ہے اور کچھ اس کے مظاہر و اشکال ہوتے ہیں، اور جس طرح برائی کے استیصال کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ شر کے ساتھ ساتھ مظاہر شر کا بھی خاتمہ کیا جائے ورنہ وہ برائی ختم نہیں ہوتی اسی طرح کسی بھلائی کے فروغ دینے کے لیے بھی ضروری ہے کہ اس کی حقیقت کے ساتھ اس کے مظاہر و اشکال کو بھی فروغ دیا جائے۔ اگر مظاہر و اشکال کو فروغ نہ دیا جائے تو وہ بھلائی بھی دب دبا کر رہ جاتی ہے، اس کو نشو و نما نہیں حاصل ہوتی۔ اس مسئلے پر ان شاء اللہ ہم اس کے محل میں گفتگو کریں گے۔ آگے اعراف کی آیت ۳۳ کے تحت بھی یہ بحث آئے گی۔

'اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ'۔ یہ ان لوگوں کو دھمکی ہے جو ان بے اصل بدعات کی حمایت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے بحث و مجادلہ کر رہے تھے۔ فرمایا کہ تم ان تمام بدعات کے ظاہر و باطن دونوں سے اپنے کو پاک کرو۔ رہے یہ لوگ جو اس بری فصل کی کاشت کر رہے ہیں وہ بہت جلد اس کا حاصل اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔

ان مباح چیزوں کو کھاؤ جن پر اللہ کا نام لیا گیا ہو

وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ۚ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ - ۱۲۱ -

اوپر والی آیت میں مشرکیہ عقائد کے تحت حرام کی ہوئی چیزوں کو کھانے کا حکم دیا ہے جب کہ ان پر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ اس آیت میں اہل عرب کے عقیدے کی رو سے اُن مباح چیزوں کو بھی کھانے کی ممانعت فرما دی جن پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔ مشرکین نے اوپر والی حلت کی طرح اس حرمت پر بھی ہنگامہ مچایا اس لیے کہ ان کے ہاں کسی ذبیحہ کی حلت و طہارت کے لیے یہ چیز ضروری نہیں تھی کہ لازماً اس پر اللہ کا نام بھی لیا جائے۔ جس چیز کو وہ حلال و طیب سمجھتے تھے اور ان کے باپ دادا بھی جس کو حلال سمجھتے تھے مسلمانوں کی طرف سے اس کی حرمت کے اعلان سے ان کے مذہبی پندار کو بڑی چوٹ لگی ہوگی اور انہوں نے اپنے عوام کے جذبات

مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے کے لیے یہ پروپیگنڈا شروع کیا ہوگا کہ یہ لو، یہ نئے دین والے تو ہم کو اور ہمارے باپ دادا سب کو حرام خور قرار دیتے ہیں اس لیے کہ ان کے ہاں وہ جانور جائز ہی نہیں جس پہ اللہ کا نام نہ لیا گیا ہے۔ 'وان الشیاطین لیوحون الی اولیائهم لیجادلوکم' سے ہمارے نزدیک ان کے اسی غوغا کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن قرآن نے ان کے اوپر والے غوغا کی طرح ان کے اس غوغا کی بھی کوئی پروا نہیں کی بلکہ صاف فرمایا کہ 'انه لفسق' کہ جس جانور پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اس کو کھانا فسق ہے اور مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ 'وان اطعتموهم انکم لمشرکون' اگر تم نے ان کے غوغا سے متاثر ہو کر ان کی بات مانی تو تم بھی مشرک ہو کر رہ جاؤ گے۔

اللہ کا نام لینا کیوں ضروری ہے؟

یہاں یہ سوال قابلِ غور ہے کہ کسی جانور کے ذبح کے وقت اس پر اللہ کا نام لینا اس قدر ضروری کیوں قرار دیا گیا کہ اس کے بغیر اس کا کھانا ہی حرام ہو جاتا ہے؟ اس کی بعض وجوہ بالکل واضح ہیں جن کی طرف ہم اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

اول یہ کہ اللہ کے نام اور اس کی تکبیر کے بغیر جو کام بھی کیا جاتا ہے وہ، جیسا کہ ہم آیت بسم اللہ کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں، برکت سے خالی ہوتا ہے۔ خدا کی ہر نعمت سے، خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، فائدہ اٹھاتے وقت ضروری ہے کہ اس پر اس کا نام لیا جائے تاکہ بندوں کی طرف سے اس کے انعام و احسان کا اعتراف و اقرار ہو۔ اس اعتراف و اقرار کے بغیر کوئی شخص کسی چیز پر تصرف کرتا ہے تو اس کا یہ تصرف غاصبانہ ہے اور غصب سے کوئی حق قائم نہیں ہوتا بلکہ یہ جسارت اور ڈھٹائی ہے جو خدا کے ہاں مستوجب سزا ہے۔

دوم یہ کہ احترامِ جان کا یہ تقاضا ہے کہ کسی جانور کو ذبح کرتے وقت اس پر خدا کا نام لیا جائے۔ جان کسی کی بھی ہو ایک محترم شے ہے۔ اگر خدا نے ہم کو اجازت نہ دی ہوتی تو ہمارے لیے کسی جانور کی بھی جان لینا جائز نہ ہوتا۔ یہ حق ہم کو صرف خدا کے اذن سے حاصل ہوا ہے اس وجہ سے یہ ضروری ہے کہ جس وقت ہم ان میں سے کسی کی جان لیں صرف خدا کے نام پر لیں۔ اگر ان پر خدا کا نام نہ لیں، یا خدا کے نام کے ساتھ کسی اور کا نام لے لیں یا کسی غیر اللہ کے نام پر ان کو ذبح کر دیں تو یہ ان کی جان کی بھی بے حرمتی ہے اور ساتھ ہی جان کے خالق کی بھی۔

سوم یہ کہ اس سے شرک کا ایک بہت وسیع دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ ادیان کی تاریخ پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ جانوروں کی قربانی، ان کی نذر اور ان کے چڑھاوے کو ابتدائے تاریخ سے عبادات میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس اہمیت کے سبب سے مشرکانہ مذاہب میں بھی اس کو بڑا فروغ

حاصل ہوا۔ جو قوم بھی کسی غیر اللہ کی عقیدت و نیازمندی میں مبتلا ہوئی اس نے مختلف شکلوں سے اس غیر اللہ کو راضی کرنے کے لیے جانوروں کی بھینٹ چڑھائی۔ قرآن میں شیطان کی جو دھمکی انسان کو گمراہ کرنے کے باب میں مذکور ہوئی ہے اس میں بھی، جیسا کہ ہم اس کے مقام میں واضح کر چکے ہیں، اس ذریعۂ ضلالت کا شیطان نے خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ اسلام نے شرک کے ان تمام راستوں کو بند کر دینے کے لیے جانوروں کی جانوں پر اللہ تعالیٰ کے نام کا قفل لگا دیا جس کو خدا کے نام کی کنجی کے سوا کسی اور کنجی سے کھولنا حرام قرار دے دیا گیا۔ اگر اس کنجی کے بغیر کسی اور کنجی سے اس کو کھولنے یا اس کو توڑنے کی کوشش کی گئی تو یہ کام بھی ناجائز اور جس جانور پر یہ ناجائز تصرف ہوا وہ جانور بھی حرام۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں صرف یہی چیز ناجائز نہیں ہے کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے نام پہ ذبح کیا گیا بلکہ یہ بھی ناجائز ہے کہ کسی جانور کو اللہ کا نام لیے بغیر ہی ذبح کر دیا جائے۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ صورت ہو سکتی ہے جس میں بھول چوک کو دخل ہو۔ اور یہ بھول چوک بھی معاف صرف اہلِ ایمان کے لیے ہے اس لیے کہ ان کے دل اور ارادے میں اللہ کا ایمان اور اس کا نام موجود ہوتا ہے۔ صرف کسی وقتی غفلت سے اس کے اظہار میں سہو ہو جاتا ہے۔

أَوَمَن كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَن مَّثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ۚ كَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكَافِرِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ○ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ أَكَابِرَ مُجْرِمِيهَا لِيَمْكُرُوا فِيهَا ۖ وَمَا يَمْكُرُونَ إِلَّا بِأَنفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ۱۲۲-۱۲۳

'اومن کان میتا الآیۃ'۔ یہاں 'موت' سے مراد کفر کی زندگی اور 'حیات' سے مراد ایمان کی زندگی ہے۔ 'نور' سے مراد وہ کتاب ہے جس کا ذکر آیت ۱۱۴ و ۱۱۹ میں گزرا جو اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کے درمیان امتیاز اور حرام و حلال کی تفصیل کے لیے اتاری۔ 'ظلمات' سے مراد وہ ظنون و اوہام اور وہ خواہشات و بدعات ہیں جن کی طرف آیات ۱۱۶ و ۱۱۹ میں اشارہ فرمایا ہے۔

اہلِ ایمان اور اہلِ کفر کی تمثیل

یہ اہلِ ایمان اور ان مشرکین کی تمثیل بیان ہوئی ہے کہ اہلِ ایمان کو اللہ نے کفر کی موت کے بعد ایمان کی زندگی بخشی ہے اور ان کو اپنی کتاب کی شکل میں ایک نورِ مبین عطا فرمایا ہے جس سے وہ خود بھی روشنی حاصل کر رہے ہیں، دوسروں کو بھی راہ دکھا رہے ہیں۔ کیا یہ لوگ ان لوگوں کے مانند ہو جائیں گے جن کی تمثیل یہ ہے کہ یہ اپنے سابق اوہام اور اپنی بدعات کی تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں اور ان سے نکلنے کا نام نہیں لیتے۔ اس تمثیل کے پیش کرنے سے مقصود مسلمانوں کی حوصلہ افزائی ہے کہ اب تم ان شیاطین جن و انس

کی غوغا آرائیوں کی پروا نہ کرو۔ تم کو خدا نے زندگی بخشی ہے تو زندگی کا پیام لے کر آگے بڑھو۔ تمہیں روشنی عطا ہوئی ہے تو اس روشنی میں خود بھی چلو اور دوسروں کو بھی روشنی دکھاؤ۔ اب تمہارے لیے یہ زیبا نہیں کہ اندھیرے میں ٹھوکریں کھانے والوں کی خرافات پر کان دھرو۔

'یمشی بہ فی الناس' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کو روشنی ملے تو اس کا حق یہ ہے کہ اس سے خود بھی رہنمائی حاصل کرے اور لوگوں میں بھی اس کو لے کر نکلے تاکہ جن کے اندر صلاحیت ہو وہ بھی اس سے فائدہ اٹھائیں۔ روشنی چھپا کر رکھنے کی چیز نہیں ہوتی بلکہ اونچی جگہ اور سرِ راہ رکھنے کی چیز ہوتی ہے۔ سیدنا مسیح نے اسی حکمت کو یوں سمجھایا ہے کہ جس کے پاس چراغ ہوتا ہے وہ پیمانہ کے نیچے ڈھانپ کے نہیں رکھتا بلکہ اونچی جگہ رکھتا ہے تاکہ اس کا اپنا گھر بھی روشن ہو اور دوسرے بھی اس سے واستہ پائیں۔

'کذٰلک زین للکافرین ما کانوا یعملون'۔ یعنی یہ اس تاریکی میں پڑے رہنے پر جو بضد ہیں اور تمہاری دکھائی ہوئی روشنی سے وحشت زدہ ہو رہے ہیں اس سے تم دل برداشتہ نہ ہو، قانونِ قدرت یہی ہے کہ جو لوگ جس چیز کو پسند کرتے ہیں ان پر وہی چیز مسلط کر دی جاتی ہے۔ اس مضمون کو آگے آیت ۱۲۵ میں یوں واضح فرمایا ہے کذٰلک یجعل اللہ الرجس علی الذین لا یؤمنون۔ (اس طرح اللہ ناپاکی مسلط کر دیتا ہے ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے) اس قانونِ الٰہی پر سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم ختمِ قلوب کی بحث میں تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں۔

'وکذٰلک جعلنا فی کل قریۃ اکابر مجرمیھا لیمکروا فیھا'۔ 'جعلنا' یہاں 'امھلنا' کے مفہوم میں ہے اور 'کذٰلک' کا اشارہ اس صورتِ حال کی طرف ہے جس کا ذکر اوپر آیت ۱۱۲ میں فرمایا ہے۔ یہ اسی سنت اللہ کا بیان کسی قدر مختلف انداز میں ہوا ہے جو اوپر آیت ۱۱۲ میں بیان ہو چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ شیاطین جن و انس اس دعوت کی مخالفت میں جو ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہیں یہ کوئی نادر واقعہ نہیں ہے۔ کسی بستی میں جب دعوتِ حق بلند ہوتی ہے تو وہاں جو باطل کے علمبردار ہوتے ہیں اور جن کا اس باطل سے مفاد وابستہ ہوتا ہے اسی طرح اپنی تمام چالوں کے ساتھ اس کو دبانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنی سنت کے مطابق ان کو بھی ایک خاص وقت تک ڈھیل دیتا ہے تاکہ جو کمائی وہ کرنا چاہتے ہیں کر لیں۔

'وما یمکرون الا بانفسھم وما یشعرون'۔ یہاں مضارع سے پہلے فعل ناقص محذوف ہے۔ یعنی وہ تو چالیں حق کے خلاف چلتے تھے لیکن یہ چالیں انہی کے خلاف پڑیں۔ حق کی مخالفت کرنے والا

حق کو نہیں بلکہ خود اپنے کو تباہ کرتا ہے لیکن چونکہ اس کے سامنے ان کا انجام نہیں آیا تھا اس وجہ سے ان کو اس کا احساس نہیں ہوا۔ یہی حال قریش کے اکابر مجرمین کا ہے۔ یہ بھی انہی کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں اور بالآخر انہی کے انجام کو پہنچیں گے لیکن ان کو اس کا احساس نہیں ہو رہا ہے۔

وَإِذَا جَاءَتْهُمْ آيَةٌ قَالُوا لَن نُّؤْمِنَ حَتَّىٰ نُؤْتَىٰ مِثْلَ مَا أُوتِيَ رُسُلُ اللَّهِ ۘ اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ ۗ سَيُصِيبُ الَّذِينَ أَجْرَمُوا صَغَارٌ عِندَ اللَّهِ وَعَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا كَانُوا يَمْكُرُونَ - ۱۲۴

یہ اس چال کی ایک مثال ہے جس کا ذکر اوپر ہوا۔ مطلب یہ ہوا کہ جب ان کے پاس اللہ کی کوئی آیت، عام اس سے کہ وہ کوئی نشانی ہو یا کوئی ہدایت و تنبیہ، آتی تو وہ یہ کہتے کہ ہم تو اس وقت تک ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں جب تک ہمیں بھی وہ رسالت نہ ملے جس کے مدعی یہ رسول لوگ ہیں۔ آخر ان کو کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے تھے کہ انہیں خدا نے اپنا رسول بنایا اور ہمیں نظرانداز کر دیا درآنحالیکہ پشتہا پشت سے قیادت و سیادت اور دولت و امارت ہمارا حصہ ہے؟ ٹھیک یہی بات، جیسا کہ قرآن میں تفصیل سے بیان ہوئی، قریش کے اکابر کہتے تھے۔ ان کو بھی وہی گھمنڈ تھا جو ان کے پیشرو مستکبرین اور مکذبین انبیاء کو تھا کہ اگر خدا کسی کو رسالت ہی دینے والا تھا تو کیا اس تاج کے لیے اس کو انہی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کا سر موزوں نظر آیا؟ آخر مکہ یا طائف کے کسی سردار پر اس کی نظر کیوں نہ پڑی؟ ظاہر ہے کہ یہ بات جو وہ کہتے تھے تو محض چالبازی کے طور پر کہتے تھے، اس سے مقصود ان کا محض اپنی انانیت اور خود فریبی کے لیے ایک پردہ فراہم کرنا اور اپنے عوام کو بیوقوف بنانا ہوتا تھا۔ سادہ لوح عوام دنیوی اسباب و وسائل کو بڑی چیز سمجھتے ہیں۔ وہ جن کو دنیا میں بڑا دیکھتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ خدا کے نزدیک بھی یہی بڑے ہوں گے۔ اس ذہن کے لوگ آسانی سے اس قسم کے جھکموں میں آ جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن نے اس بات کو مکر سے تعبیر کیا ہے یعنی یہ ایک سیاسی اشتغلا تھا۔

'اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ'۔ یہ ان مستکبرین کو جواب ہے اور گو لفظاً سخت نہیں ہے لیکن معناً بہت سخت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ منصبِ رسالت ایسی چیز نہیں ہے جس کا اہل ہر کس و ناکس بن جائے، یہ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ یہ تاج وہ کس کے سر پر رکھے۔ یہ مخمل اور زربفت کی تھیلوں نہیں ہے جو بسا اوقات گدھوں پر بھی نظر آ جاتی ہے بلکہ یہ خلعتِ الٰہی اور تشریفِ آسمانی ہے جو انہی کو نصیب ہوتی ہے جن کا انتخاب اللہ تعالیٰ فرمائے۔

اس ٹکڑے سے جہاں یہ بات نکلتی ہے کہ نبوت و رسالت ایک موہبتِ ربانی اور ایک عطیۂ الٰہی

جو صرف اسی کو حاصل ہوتی ہے جس کو اللہ تعالیٰ اس کے لیے انتخاب فرمائے وہیں یہ بات بھی اس سے نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے لئے انتخاب انہی کو فرماتا ہے جو اپنی اکتسابی صلاحیتوں اور خوبیوں کے اعتبار سے نوعِ انسانی کے گل سر سبد، نخلِ فطرت کے بہترین ثمر اور کمالِ انسانیت کے مظہرِ اتم ہوتے ہیں۔

'سیصیب الذین اجرموا صغار عند اللہ و عذاب شدید بما کانوا یمکرون'۔ 'اجرموا' یں اگرچہ ان کے وہ تمام جرائم اور ان کی وہ ساری چال بازیاں شامل ہیں جن کے وہ مرتکب ہوئے لیکن یہاں اس سے ان کے اس استکبار کی طرف خاص اشارہ ہو رہا ہے جس کا اظہار انہوں نے 'لن نؤمن حتی نؤتی مثل ما اوتی رسل اللہ' میں کیا۔ اسی استکبار کے تعلق سے ان کے لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں ذلت بھی ہے اور عذاب شدید بھی۔

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ۭ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَي الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ۝ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۔ ۱۲۵ - ۱۲۷

'فمن یرد اللہ الایہ'۔ 'حرج' جھاڑیوں سے بھری ہوئی تنگ جگہ کو کہتے ہیں۔ یہاں یہ 'ضیق' کے بعد اس کی تاکید مزید کے طور پر آیا ہے۔ 'تصعد' تکلیف اور بمشقت کسی بلندی پر چڑھنے کے لئے معروف ہے۔ لفظ 'سما' جس طرح آسمان اور بادلوں کے لئے آتا ہے اسی طرح فضا اور ہر بلندی کے لئے بھی آتا ہے۔ مثلاً كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۲۴ - ابراہیم (کلمہ طیبہ کی مثال ایک بار آور درخت کی ہے جس کی جڑ زمین میں گہری اتری ہوئی ہو اور اس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہوں)۔

اب یہ اصل علت بیان ہو رہی ہے ان کے ایمان نہ لانے کی۔ وہ یہ ہے کہ یہ اللہ کی توفیق ہدایت سے محروم ہو گئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ساری سخن سازیاں اور تمام چالبازیاں تو محض ظاہر کا پردہ ہیں۔ اصل چیز جو ان کے لیے قبول اسلام میں مانع ہے کفر و شرک کی وہ نجاست ہے جس کے ردے پر ردے ان کے دلوں پر جم گئے ہیں جس کے سبب سے ان کو اسلام کا راستہ ایک کٹھن چڑھائی معلوم ہوتا ہے، جس کے تصور سے ان کا سینہ بھنچتا اور دم اکھڑتا ہے گویا ان کو ایک بلند چڑھائی چڑھنی پڑ رہی ہے جن کے دلوں پر یہ نجاست جم جاتی ہے اللہ تعالیٰ ان کے سینے اسلام کے لئے تنگ کر دیتا ہے، جیسا کہ اوپر کذلک

زین للکافرین ما کانوا یعملون ۱۲۲ کے الفاظ سے اشارہ فرمایا۔ اسلام کے لیے سینے کھلتے ان کے ہیں جن کے سینے اس قسم کے جھاڑ جھنکاڑ سے صاف ہوتے ہیں۔ یہ چیز چونکہ بالکل سنت الٰہی کے مطابق واقع ہوتی ہے، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو منسوب اپنی طرف فرمایا ہے۔ اس کو اسی روشنی میں سمجھنا چاہیئے جس روشنی میں . . . اس کی وضاحت ہم اس کتاب میں ایک سے زیادہ مقامات میں کر چکے ہیں۔

'ھذا صراط ربک مستقیما ۭ الایہ'۔ چونکہ اشارہ کے اندر فعل کے معنی پائے جاتے ہیں اس وجہ سے 'مستقیما' یہاں 'صراط' سے حال پڑا ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اسلام ہے تو خدا کی کھولی ہوئی سیدھی راہ، فطرت کی صراط مستقیم، نہ اس میں پیچ و خم ہیں، نہ چڑھائیاں اور گھاٹیاں لیکن انہوں نے اپنے اوپر اتنی غیر فطری نجاستیں لاد رکھی ہیں ان کو یہ راہ دشوار گزار معلوم ہو رہی ہے۔ 'قد فصلنا الآیات لقوم یذکرون'۔ یعنی اس کے دین فطرت اور ملت ابراہیم ہونے کے سارے دلائل تفصیل سے ہم نے بیان کر دیئے ہیں لیکن دلائل کارآمد ان کے لیے ہوتے ہیں جن کے اندر یاد دہانی حاصل کرنے اور سوچنے سمجھنے کا ارادہ پایا جاتا ہے۔

'لھم دار السلام عند ربھم وھو ولیھم بما کانوا یعملون'۔ یہ صلہ بیان ہوا ہے ان لوگوں کا جن کے سینے اللہ تعالیٰ اسلام کے لیے کھولتا ہے۔ فرمایا کہ ان کے لئے اس اسلام کے صلہ میں دار السلام، سکھ اور چین کا گھر ہوگا اور اللہ ان کا ساتھی ہوگا جبکہ اسلام کے معاندین کے لیے ذلت اور عذاب کا گھر ہوگا اور ان کے ساتھی وہ شیاطین جن و انس ہوں گے جن کے القائے شیطانی کو قبول کر کے یہ گمراہ ہوئے۔ یہ ٹکڑا اوپر والے ٹکڑے 'سیصیب الذین اجرموا' کے بالکل بالمقابل ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَقَالَ اَوْلِيٰۗـؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ۭ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَاۗءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝ وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًۢا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَاۗءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۭ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓي اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ۝ ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰي بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ۝ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۭ وَمَا

رَبُّکَ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ ○ ۱۲۸ - ۱۳۲

ذریتِ ابلیس کی ایک بڑی اور اولادِ آدم کی سادہ لوحی

'ویوم یحشرھم جمیعا' ۔ 'ھم' سے مراد وہی اکابر مجرمین ہیں جن کا ذکر آیات ۱۲۲ - ۱۲۴ میں گزرا اور 'جمیعا' کی تاکید اس بات کو ظاہر کر رہی ہے کہ شیاطین انس کے ساتھ ساتھ وہ شیاطین الجن بھی جمع کئے جائیں گے جن کے القاء و الہام کی انہوں نے پیروی کی جیسا کہ اوپر آیت ۱۱۲ سے ان کا ذکر چلا آرہا ہے۔ ان سب کو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ جمع کر کے شیاطین الجن کو مخاطب کر کے فرمائے گا کہ یا معشر الجن قد استکثرتم من الانس (اے جنوں کے گروہ تم نے تو انسانوں میں سے بہتوں کو اپنا ہمنوا بنا لیا) ظاہر ہے کہ یہاں 'جنوں کے گروہ' سے مراد جنوں کی پوری امت نہیں ہے بلکہ ان کے اندر کا وہی گروہ مخاطب ہے جس نے اپنے مرشد و پیشوا ابلیس کی پیروی کی جو خود بھی، جیسا کہ قرآن میں ثابت ہے، جنوں ہی میں سے تھا اور جس نے آدمؑ کو دھوکہ دیا اور سجدہ کے حکم کی تعمیل سے انکار کرتے ہوئے بڑے فخر سے دعوے کیا تھا کہ اَرَءَیْتَكَ هٰذَا الَّذِیْ كَرَّمْتَ عَلَیَّ لَىِٕنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّیَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۶۲ - بنی اسرائیل﴾ (بھلا یہ ہے وہ جس کو تو نے میرے اوپر فضیلت بخشی ہے، اگر تو نے مجھے قیامت تک کے لیے مہلت دی تو میں اس کی ساری ذریت کو چٹ کر جاؤں گا، صرف تھوڑے ہی مجھ سے بچ رہیں گے) دوسرے مقام میں یہ ہے لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِیْمَ ○ ثُمَّ لَاٰتِیَنَّهُمْ مِّنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ وَ عَنْ اَیْمَانِهِمْ وَ عَنْ شَمَآىِٕلِهِمْ ؕ وَ لَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِیْنَ ۱۶-۱۷ اعراف (میں تیری سیدھی راہ پر ان کی گھات میں بیٹھوں گا۔ پھر میں ان کے آگے سے، ان کے پیچھے سے، ان کے داہنے سے، ان کے بائیں سے ان کی راہ ماروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا) یہاں اصحاب ذوق آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ 'استکثرتم' کے لفظ میں نہایت لطیف تلمیح ہے ابلیس کے قول ولا تجد اکثرھم شاکرین اور لاحتنکن ذریتہ الا قلیلا' کی طرف - یعنی اللہ تعالیٰ ابلیس کے ان فرزندان معنوی کو خطاب کر کے فرمائے گا کہ تم نے تو اپنے پیشوا ابلیس کا مشن بڑی کامیابی سے پورا کیا کہ ذریت آدمؑ میں سے بہتوں کو اپنے فتراک ضلالت کا نخچیر بنا لیا - اور بڑی سعادت مند نکلی یہ اولاد آدم کہ اس سادہ لوحی کے ساتھ تمہارے دام فریب میں پھنس گئی -

شیطان کے پیروؤں کا اعتراف اور حسرت

'قال اولیاؤھم من الانس ربنا استمتع بعضنا ببعض وبلغنا اجلنا الذی اجلت لنا' ۔ انسانوں میں سے جو لوگ ان شیاطین جن کے ساتھی بنے ہوں گے وہ اس

پر اعتراف کریں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہم نے ایک دوسرے کی معیت و رفاقت سے دنیا میں خوب حظ اٹھایا یہاں تک کہ اس یوم الحساب کو پہنچ گئے جو تو نے ہمارے لیے مقرر کیا تھا۔ 'حظ اٹھانے' سے مطلب یہ ہے کہ ہم ان کے 'کارندے' بنے، ہم نے ان کی پوجا کی، ان کے تھانوں پر نذریں اور قربانیاں پیش کیں اور ان کے کہنے پر حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنایا، اسی طرح ہمارے کاہنوں، ساحروں اور سیانوں نے ان کو اپنے مطالب مزعومہ کے لیے طرح طرح سے استعمال کیا، یہاں تک کہ یہ دن آگیا اور ہمیں اپنے اس عمل کے انجام پر غور کرنے کی توفیق نہ ملی۔ یہ واضح رہے کہ عرب جاہلیت میں جنوں کو عربوں کی مذہبی اور سماجی زندگی میں بڑا دخل ہو گیا تھا، کہانت اور ساحری کی ساری گرم بازاری تو ان کے دم قدم سے تھی ہی، شاعری تک کے متعلق ان کا خیال یہ تھا کہ یہ جنات الہام کرتے ہیں، وہ ہر بڑے شاعر کے ساتھ کوئی نہ کوئی جن حاضر ہوتا ہے۔ اسی بنا پر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی یہ سمجھتے کہ ان کے ساتھ کوئی جن ہے۔ ہر وادی کے الگ الگ جن مانے جاتے تھے اور سفر، حضر، جنگ، صلح اور فتح کے معاملات میں ان کے تصرفات کو بڑا دخل سمجھا جاتا تھا۔

یہاں بلاغت کلام کا ایک نکتہ قابل لحاظ ہے۔ شیاطین انس یہ بات بطور اعتراف جرم اور بقصد اظہار ندامت کہیں گے اور یہ تمہید باندھ کر وہ اللہ تعالیٰ سے معافی کی درخواست کرنا چاہیں گے لیکن اسلوب کلام صاف شہادت دے رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی بات تمہید پوری ہونے سے پہلے ہی کاٹ دے گا اور ان کو معذرت اور درخواست معافی کا موقع دیئے بغیر ہی اپنا فیصلہ سنا دے گا کہ 'النار مثواکم خالدین فیھا' کہ بس اب تمہارا ٹھکانا یہی دوزخ ہے جس میں تمہیں ہمیشہ رہنا ہے، اب باتیں بنانے کی کوشش نہ کرو، عذر، معافی، توبہ اور اصلاح سب کے دروازے بند ہو چکے ہیں -

یہاں ایک اور چیز بھی قابل غور ہے۔ وہ یہ کہ 'خالدین فیھا' کے بعد الا ما شاء اللہ کے الفاظ بھی ہیں جس سے بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ خلود مقید بمشیت الٰہی ہے۔ اسی طرح کا اسلوب سورۂ ہود میں بھی ہے۔ خالدین فیھا مادامت السموات والارض الا ما شاء ربک ۱۰۷ - ہود (وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم رہیں، مگر جو تیرا رب چاہے) اس استثناء کے باب میں ہمارے سامنے بہت سے لوگ ذہول کو تردد پیش آیا ہے اس لیے کہ اس سے بظاہر یہ بات نکلتی ہے کہ یہ خلود اس معنی میں خلود نہیں ہے جس معنی میں ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی کوئی نہایت ہی نہیں ہے بلکہ وہ طول مدت کے مفہوم میں ہے اگرچہ یہ مدت کتنی ہی طویل ہو۔ بعض لوگوں نے اس سے بچنے کے خیال سے 'ما' کو 'من' کے معنی میں لیا ہے لیکن اول تو یہ عربیت کے خلاف ہے ثانیاً اس سے بھی وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا جو وہ حاصل کرنا

چاہتے ہیں اس لئے کہ یہ استثنا بہرحال انہی مستحقین خلود ہی میں سے ہوگا جن کا ذکر ہے تو پھر فرق کیا ہوا، خلود تو پھر بھی غیر منتہی خلود کے معنی میں نہیں رہا اگرچہ انہی کے حد تک سہی جن کو مشیت الٰہی اس سے مستثنیٰ قرار دے دے۔ میرے نزدیک 'ماشاء اللہ' اور 'ماشاء ربک' کی قید یہاں اس خلود کے منتہی ہونے کو ظاہر نہیں کرتی بلکہ اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ ان مجرمین کے لئے اس عذاب نار میں گرفتار ہو جانے کے بعد امید کے سارے دروازے بند ہو جائیں گے، کسی کی سعی، کسی کی سفارش، کسی کا زور، کسی کی فریاد کچھ کارگر نہ ہوگی، اختیار اور ارادے کی ساری حدیں ختم ہو جائیں گی، توبہ اور اصلاح اور حسرت و ندامت کی مہلتیں گزر جائیں گی۔ واحد چیز جو کارفرما ہوگی وہ خدا کی مشیت ہے اور اپنی مشیت کے بھیدوں کو وہی جانتا ہے۔ وہ فعال لما یرید اور حکیم وعلیم ہے۔ قرآن سے جو بات نکلتی ہے وہ تو اسی حد تک ہے۔ جن لوگوں نے اس حد سے آگے بڑھ کر اس سے کچھ اور نتائج نکالنے کی کوشش کی ہے ان کے نتائج کو ان کے دلائل کی کسوٹی پر جانچئے۔ قرآن پر ان کی ذمہ داری ڈالنا صحیح نہیں ہے۔ ویسے یہ امر یاد رہے کہ خلود اور ابدیت کے مسائل ایسے نہیں ہیں جن کا احاطہ انسان کا محدود علم کر سکے۔ اگر انسان ان چیزوں کے چکر میں پڑے تو بات متشابہات کے حدود میں نکل جاتی ہے جن میں پڑنے سے ہم کو روکا گیا ہے۔ اس وجہ سے سلامتی کا راستہ یہی ہے کہ جتنی بات خدا نے بتا دی ہے اس کو مانئے اور اس کے آگے کے مراحل کو خدا کے علم کے حوالہ کیجئے۔

'وکذٰلک نولی بعض الظٰلمین بعضا' الاٰیۃ: یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف جو اوپر 'یا معشر الجن قد استکثرتم من الانس' کے ٹکڑے میں مذکور ہوئی۔ 'ولی' 'تولیۃ' 'فلانا الامر' کے معنی ہیں فلاں کو اس پر حاکم، والی اور قابض بنا دیا اور اس پر مسلط کر دیا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو شیاطین جن نے بے شمار انسانوں پر اپنا تسلط جما لیا تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان شیاطین کو انسانوں پر اختیار ملا ہوا تھا بلکہ اس کا سبب خود ان کے اعمال ہوئے ہیں۔ انہوں نے خدا کی ہدایت چھوڑ کر اپنی خواہشات و بدعات کی پیروی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شیطان کے پیرو بن گئے اور اللہ تعالیٰ کا قاعدہ یہ ہے کہ جو لوگ شیطان کے پیرو بن جاتے ہیں ان پر وہ شیاطین کو مسلط کر دیتا ہے۔ ظالمین سے مراد یہاں کفر و شرک کی راہ اختیار کرنے والے ہیں۔ یہ مضمون پوری تفصیل سے پیچھے بھی گزر چکا ہے اور آگے بھی مختلف شکلوں میں بیان ہوگا۔

'یا معشر الجن والانس الم یاتکم رسل منکم یقصون علیکم اٰیاتی وینذرونکم لقاء یومکم ھٰذا': یہ سوال ان سے بطور قطع عذر کے ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ شامت زدو، کیا تمہارے پاس تمہی میں سے میری آیتیں سنانے اور اس دن کی آمد سے ہوشیار کرتے ہوئے رسول

نہیں آئے؟ پھر تم نے آخر اپنی یہ شامت کیوں بلائی؟ رسول نہ آئے ہوتے تو تم کوئی عذر پیش کر سکتے تھے اب کیا عذر پیش کر سکتے ہو؟ تم نے تو سب کچھ سن اور سمجھ کے اپنی آنکھیں اور اپنے کان بند رکھے۔

'رسل منکم' سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے اندر انسانوں ہی میں سے رسول بھیجے اسی طرح جنوں کے اندر جنوں میں سے رسول بھیجے۔ انبیاء و رسل کے باب میں اللہ تعالیٰ کی جو سنت ہے اور جو تفصیل سے قرآن میں بیان ہوئی ہے اس کا لازمی اقتضا بھی یہی ہے کہ جنوں کے اندر انہی کے اندر سے رسول آئیں جو ان کی بولی میں، ان کی ضروریات و حالات کے مطابق ان پر اللہ کی حجت تمام کریں۔ اتمام حجت انبیاء و رسل کی بعثت کا اصل مقصد ہوتا ہے جو بغیر اس کے ممکن نہیں کہ ہر گروہ کے اندر ان کی فطرت کے مطابق رسول آئیں۔ انسان اور جن دو مختلف قومیں ہیں، دونوں کے مسائل اگر کل نہیں تو بیشتر الگ الگ ہیں۔ اشتراک ہو سکتا ہے تو عقائد اور اخلاق کے بعض اصولوں میں ہو سکتا ہے، شریعت، قانون اور معاشرت کے مسائل تو لازماً الگ الگ ہوں گے۔ پھر رسول جو اسوہ اور نمونہ بن کر آتے ہیں اگر ان کے اندر سے نہ ہوئے تو وہ ان کے لئے اسوہ اور نمونہ کیسے بن سکتے ہیں؟ جب ہم انسانوں کے لئے جنات میں سے کوئی رسول اسوہ نہیں بن سکتا تو انسانوں میں سے کوئی رسول جنوں کے لئے کیسے اسوہ بن سکتا ہے! ہر قوم کا رسول ان کے اندر سے ہونے کا خاص پہلو، اتمام حجت کے نقطۂ نظر سے یہی ہے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ گویا اس قوم پر خود اس کی زبان، خود اس کے ضمیر، خود اس کے ایک بھائی اور خود اسی کے ایک فرد کامل کے ذریعے سے اس پر حجت قائم کر دیتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جنات قیامت کے روز اس سوال کے جواب میں یہ عذر کر سکتے تھے کہ اے رب ہم جنات کے لئے کسی غیر جن کا قول و عمل کس طرح حجت ہو سکتا تھا۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ جس طرح جنوں کے اشرار و شیاطین اور انسانوں کے اشرار و شیاطین میں حق کی مخالفت کے لئے گٹھ جوڑ ہو جایا کرتا ہے، جیسا کہ اوپر کی آیات میں بیان ہوا، اسی طرح بعض مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں کہ جنوں کے اندر جو ابرار و صالحین ہیں ان کی طرف سے اس حق کی بھی تائید ہوتی ہے جو انسانوں کے انبیاء و صالحین کے ذریعے سے ظاہر ہوا ہے اس لئے کہ حق، اصولی حیثیت سے نہ صرف انسانوں اور جنوں کے درمیان ایک متاع مشترک کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ تمام کائنات کی متاع مشترک ہے۔ اس مسئلے پر انشاء اللہ تفصیل کے ساتھ ہم سورہ جن میں بحث کریں گے۔ یہاں اس اشارے پر کفایت کیجئے۔

'یقصون علیکم اٰیاتی': یہ ممکن ہے کسی کو 'یقص' کا لفظ آیات سنانے کے لئے کھٹکے اس لئے کہ اس لفظ کا معروف استعمال سرگزشتیں سنانے ہی کے لئے ہے۔ ہمارے نزدیک یہاں یہ لفظ اس وجہ سے استعمال ہوا ہے کہ آیات سے یہاں مراد آیات انذار ہیں جن کا غالب حصہ مکذبین و

منکرین کے انجام اور ان کی سرگزشتوں کے بیان پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہاں موقع و محل اسی کا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سے جو سوال فرمائے گا اس کا مطلب یہی ہوگا کہ کیا تمہیں میرے رسولوں نے جھٹلانے والوں کے انجام اور اس دن کی آمد سے خبردار نہیں کیا تھا کہ تم نے اپنے آپ کو اس ابدی ہلاکت میں ڈالا؟

انجام کار ان کو خود اپنے خلاف گواہی دینی پڑے گی

'قالوا شهدنا على انفسنا وغرتهم الحيوة الدنيا وشهدوا على انفسهم انهم كانوا كفرين' - بعینہٖ یہی بات سورۂ ملک میں یوں بیان ہوئی ہے كُلَّمَآ أُلْقِيَ فِيهَا فَوْجٌ سَأَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَذِيرٌ ۝ قَالُوا بَلَىٰ قَدْ جَآءَنَا نَذِيرٌ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللَّهُ مِن شَيْءٍ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا فِي ضَلَٰلٍ كَبِيرٍ ۝ وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيٓ أَصْحَٰبِ السَّعِيرِ ۝ فَاعْتَرَفُوا بِذَنۢبِهِمْ فَسُحْقًا لِّأَصْحَٰبِ السَّعِيرِ (ملک ۹-۱۱) (جب جب اس میں کوئی جھونکی جائے گی کوئی پارٹی دوزخ کے داروغے اس سے سوال کریں گے، کیا تمہارے پاس کوئی آگاہ کردینے والا نہیں آیا تھا؟ وہ کہیں گے، ہاں بے شک ہمارے پاس آگاہ کردینے والا آیا تھا لیکن ہم نے اس کو جھٹلا دیا اور کہا کہ خدا نے کوئی چیز نہیں اتاری ہے، تم لوگ تو ایک بہت بڑی گمراہی میں مبتلا ہو۔ اور وہ کہیں گے اگر ہم سننے اور سمجھنے والے لوگ ہوتے تو دوزخ میں پڑنے والے نہ بنتے۔ پس وہ اپنے جرم کا اعتراف کرلیں گے، پس دفع ہوں یہ دوزخ والے!)

آیت کے بیچ میں 'غرتهم الحيوة الدنيا' کے الفاظ بطور جملہ معترضہ کے اس حقیقت کو ظاہر کر رہے ہیں کہ جس بات کا آج اس جسارت سے انکار کر رہے ہیں، کل اس بے بسی کے ساتھ اس کا اقرار کریں گے اور اپنے خلاف خود گواہ بنیں گے کیونکہ آج ان کے انکار کی بنیاد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس دنیا کی ظاہر فریبی نے ان کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ اس دنیا کا کارخانہ چونکہ جزا و سزا کے اصول پر نہیں چل رہا ہے بلکہ ابتلا کے اصول پر چل رہا ہے جس میں حق کے ساتھ باطل کو بھی مہلت ملی ہوئی ہے اس وجہ سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ جزا و سزا ہے ہی نہیں اور نبی جو کچھ کہتے ہیں یہ محض ہوائی باتیں ہیں۔

عذاب سے پہلے اتمام حجت

'ذلك ان لم يكن ربك مهلك القرى بظلم واهلها غافلون' - یہ وجہ بیان فرمائی ہے اس بات کی کہ کیوں یہ اہتمام کیا گیا کہ ہر قوم کے اندر، خواہ انسان ہوں یا جن، انہی کے اندر سے رسول آئیں۔ فرمایا کہ ایسا اس لئے ہوا کہ تیرے رب کی رحمت سے یہ بات بعید تھی کہ وہ کسی قوم کو اس کے کفر و شرک پر اس کے نتائج و عواقب سے آگاہ کئے بغیر، اس پر عذاب بھیج دے۔ وہ کسی کو سزا دیتا ہے تو اس سے پہلے ان کو اچھی طرح آگاہ کردیتا ہے تاکہ وہ توبہ و اصلاح کرنا چاہیں تو توبہ و اصلاح

کرلیں اور اگر نہ کرنا چاہیں تو اپنی ذمہ داری پر اس کے نتائج بھگتیں۔

دوزخ میں جزائے عمل کے اعتبار سے درجہ بندی

'ولكل درجات مما عملوا وما ربك بغافل عما يعملون' - لفظ 'کل' پر ہم مختلف مقامات میں لکھ چکے ہیں کہ جب یہ اس طرح آتا ہے تو اس سے مراد وہی اشخاص یا پارٹیاں ہوتی ہیں جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہوتا ہے۔ یہاں اس سے مراد جنوں اور انسانوں کے وہی گروہ ہیں جن کا ذکر اوپر گزرا۔ فرمایا کہ انہوں نے جو کچھ کیا، جان بوجھ کر، خدا کی طرف سے اتمام حجت کے بعد کیا، اس وجہ سے حق ہے کہ وہ اپنے کیے کی سزا بھگتیں اور جن کے جس درجے کے جرائم ہیں اسی اعتبار سے وہ دوزخ میں اپنا مقام پائیں۔ چونکہ اللہ ان کے اعمال سے جو یہ کرتے رہے ہیں یا کرتے ہیں اچھی طرح باخبر ہے اس وجہ سے اس کو ان کی درجہ بندی میں کوئی زحمت نہیں پیش آئے گی وہ ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کا وہ اپنے اعمال کے اعتبار سے سزاوار ہوگا۔

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۚ إِن يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنۢ بَعْدِكُم مَّا يَشَآءُ كَمَآ أَنشَأَكُم مِّن ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ ءَاخَرِينَ ۝ إِنَّ مَا تُوعَدُونَ لَءَاتٍ ۖ وَمَآ أَنتُم بِمُعْجِزِينَ ۝ قُلْ يَٰقَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ مَن تَكُونُ لَهُۥ عَٰقِبَةُ الدَّارِ ۗ إِنَّهُۥ لَا يُفْلِحُ الظَّٰلِمُونَ ۝ ۱۳۳ - ۱۳۵

قریش کو براہ راست دھمکی

اوپر جو باتیں بیان ہوئی تھیں اگرچہ واضح طور پر ان کا رخ قریش ہی کی طرف تھا لیکن ان کی نوعیت اصولی باتوں کی تھی۔ اب یہ صاف صاف قریش کو مخاطب کرکے دھمکی دی کہ جہاں تک اتمام حجت کا تعلق ہے اس کا سامان خدا نے تمہارے لئے بھی کر دیا ہے۔ اب تمہاری قسمت بھی میزان میں ہے۔ اگر تم نے اپنے آپ کو نہ سنبھالا تو خدا کی پکڑ میں آجاؤ گے اور جب اس کی پکڑ میں آجاؤ گے تو پھر اس کے قابو سے باہر نہ نکل سکو گے۔

اتمام حجت کے بعد انجام اور رحمت کا تقاضا

'وربك الغني ذو الرحمة' - فرمایا کہ تمہارا خداوند غنی اور بے نیاز بھی ہے اور رحمت والا بھی ہے۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ صفات جب اس طرح حرف عطف کے بغیر بیان ہوتی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ صفتیں موصوف میں بیک وقت موجود ہیں۔ وہ ایک ہی وقت میں غنی بھی ہے اور رحمت والا بھی۔ اپنی صفت غنا کی وجہ سے اس کو کسی کی پروا نہیں، وہ سب سے بے نیاز، سب سے مستغنی اور سب سے بے پروا ہے۔ سب اس کا انکار کردیں تو اس کا کچھ نہیں بگڑتا، سب اس کی حمد کے ترانے گائیں تو اس کا کچھ نہیں بنتا۔ وہ اگر اپنے رسول بھیجتا ہے، کتاب

آمادہ کرتا ہے، ایمان و اسلام کی دعوت دیتا ہے تو اس لئے نہیں کہ لوگوں کے ایمان و اسلام کے بغیر اس کا کوئی کام اٹکا ہوا ہے بلکہ یہ سب کچھ اس لئے کرتا ہے کہ بے نیاز ہونے کے ساتھ ساتھ وہ رحمت والا بھی ہے۔ اس کی اس رحمت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ لوگوں پر اپنی حجت تمام کیے بغیر ان کو نہیں پکڑتا بلکہ ان پر حجت تمام کرنے کے لیے سارے جتن کرتا ہے اور اس وقت تک وہ لوگوں کو مہلت دیتا ہے جب تک وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر نہ لیں۔ یہ تمہید ہے اس بات کی جو آگے آ رہی ہے۔

ان یشا یذھبکم ویستخلف من بعدکم ما یشاء کما انشاکم من ذریۃ قوم اٰخرین۔ مطلب یہ ہے کہ تمہاری ان تمام سرکشیوں کے باوجود جو تمہاری پکڑ نہیں ہو رہی ہے تو اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ خدا پکڑ نہیں سکتا یا تمہارے فنا ہو جانے سے اس کی دنیا اجڑ جائے گی اور پھر اس کے آباد کرنے والے نہیں ملیں گے بلکہ اس کا واحد سبب اس کی رحمت ہے۔ ورنہ اگر وہ تم کو فنا کرنا چاہے تو جب چاہے فنا کر دے اور تمہاری جگہ جس چیز کو چاہے دے دے۔ اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو تمہارے قیاس سے بالاتر ہو۔ آخر تم بھی تو اس زمین پر روزِ ازل سے نہیں ہو۔ تم سے پہلے اسی ملک میں دوسری قومیں آباد تھیں جن کی تاریخ تمہیں سنائی جا چکی ہے اور جن کے آثار اس ملک میں موجود ہیں۔ تمہاری ہی طرح خدا نے ان کی طرف رسول بھیجے لیکن انہوں نے سرکشی کی، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فنا کر دیئے گئے اور بالآخر تم ان کے وارث ہوئے۔ تو جس خدا نے ان کو مٹا کر تمہیں ان کا وارث بنایا، اگر وہ تمہیں مٹا کر دوسروں کو تمہارا وارث بنا دے تو کون ہے جو اس کا ہاتھ پکڑ سکے؟ تمہاری تو اپنی ہی تاریخ تمہارے اوپر حجت ہے۔

زبان کا ایک نکتہ

اس آیت میں زبان کا ایک نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے۔ فرمایا کہ 'ویستخلف من بعدکم ما یشاء'۔ حالانکہ بظاہر 'من یشاء' ہونا تھا اس لئے کہ 'ما' کا غالب استعمال بے جان چیزوں ہی کے لیے ہے۔ میرے نزدیک 'من' کی جگہ 'ما' کا استعمال اللہ تعالیٰ نے اپنی کامل قدرت کے اظہار اور قریش کے غرور پر ضرب لگانے کے لیے فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنی قوت و سطوت پر کیا اترا رہے ہو، خدا کی قدرت تو وہ ہے کہ وہ تمہارے اس صحرا کی جس چیز کو چاہے تمہاری جگہ لینے کے لئے اٹھا کھڑی کرے۔ سیدنا مسیحؑ نے بھی ایک جگہ بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ تم اس بات پر گھمنڈ نہ کرو کہ تم ابراہیمؑ کی اولاد ہو، میرا خداوند چاہے تو ریگستان کے ذروں سے ابراہیم کے لیے اولاد اٹھا کھڑی کرے۔ بعینہٖ یہی زور قرآن کے اس اسلوب میں مضمر ہے بلکہ قرآن کا اسلوب اپنی تعمیم کے پہلو سے زیادہ زوردار ہے۔

'ان ما توعدون لاٰت وما انتم بمعجزین'۔ 'توعدون' میں وہ عذاب بھی داخل ہے جس کی، رسول کی تکذیب کی صورت میں، ان کو دھمکی سنا دی گئی تھی اور وہ یوم الحساب بھی جو اس کائنات

کی ایک اٹل حقیقت ہے۔ فرمایا کہ یہ دونوں باتیں شدنی ہیں اور جب ان کا ظہور ہوگا تو تم خدا کے قابو سے کسی طرح باہر نہ نکل سکو گے۔ 'اعجزہ الشیٔ' فاتہ ولم یقدر علیہ'۔ 'اعجزہ الشیٔ' کے معنی ہوں گے فلاں چیز اس کے قبضہ سے نکل گئی، وہ اس پر قابو نہ پا سکا۔ اس دھمکی میں یہ بات مضمر ہے کہ عذاب کے لئے جلدی نہ مچاؤ، اگر تم نے اپنی روش نہ بدلی تو یہ چیز تو آ کے رہے گی۔

پیغمبر کی طرف سے اعلان برأت اور دھمکی

قل یا قوم اعملوا علیٰ مکانتکم انی عامل۔ اس میں عربیت کے معروف اسلوب کے مطابق اس کا مقابل محذوف ہے۔ یعنی 'انی عامل علیٰ مکانتی'۔ 'مکانۃ' کے معنی جگہ، منزلت اور مقام کے ہیں۔ قرآن میں یہ جگہ ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً 'ولو نشاء لمسخنٰھم علیٰ مکانتھم' ۶۷ یٰس (اگر ہم چاہتے ان کی جگہ ہی پر ان کو مسخ کر دیتے) طریقہ کا مفہوم اس لفظ کے لازم کے طور پر پیدا ہوتا ہے۔ جب ہم کہیں گے تم اپنی جگہ کام کرو، میں اپنی جگہ کام کرتا ہوں تو طریقہ کا مفہوم اس کے اندر آپ سے آپ پیدا ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تم اپنے مقام کفر اور موقف مخالفت حق سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہو تو کر و جو کرنا چاہتے ہو۔ میں بھی اپنے موقف سے بال برابر ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ عربیت کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ 'اعمل' کے مقابل میں 'انی عامل' میں زور زیادہ ہے اس لئے کہ صفت اور فاعل کے صیغے فعل کے بالمقابل دوام، استمرار، استقلال اور عزم و جزم کو ظاہر کرتے ہیں۔ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ یہ پیغمبرؐ کی طرف سے صاف صاف برأت کا اعلان اور منہایت واضح الفاظ میں دھمکی ہے۔

اصل کامیابی

فسوف تعلمون من تکون لہ عاقبۃ الدار۔ یہ اصل دھمکی ہے۔ یعنی تم بہت جلد دیکھ لو گے کہ انجام کار کی کامیابی کس کو حاصل ہوتی ہے۔ 'عاقبۃ' کا لفظ یوں تو انجام کے معنی میں معروف ہے خواہ نیک انجام ہو یا بد لیکن بعض اوقات یہ مخصوص طور پر انجام خیر و فلاح ہی کے معنی میں آتا ہے۔ یہ گویا لفظ کا استعمال اس کے حقیقی مفہوم کے اعتبار سے ہوتا ہے اس لئے کہ قابلِ ذکر انجام تو وہی ہے جو اس فلاح و سعادت پر منتہی ہو جو اصل غایت ہے اس کائنات کی تخلیق کی نہ کہ نامرادی و خسران کا انجام جو اس غایت سے انحراف کا لازمہ ہے۔ چنانچہ یہ لفظ فلاح و سعادت کے مفہوم میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے مثلاً 'فاصبر ان العاقبۃ للمتقین' ۴۹ ھود (پس ثابت قدم رہو، عاقبت کار کی کامیابی اہلِ تقویٰ ہی کے لئے ہے) 'والعاقبۃ للتقویٰ' ۱۳۲۔ طٰہٰ (اور انجام کار کی کامیابی تقویٰ کے لئے ہے) 'الدار' سے مراد دارِ آخرت ہے۔ اس لئے کہ اصل نتائج کے ظہور کی جگہ وہی ہے۔ اہلِ ایمان دنیا میں جو جد و جہد کرتے ہیں وہ اسی کو سامنے رکھ کر کرتے ہیں۔ اہلِ ایمان کو دنیا میں جو کامیابی حاصل ہوتی ہے اگرچہ کامیابی وہ بھی ہے لیکن وہ فیصلہ کن نہیں ہے۔ اس لیے کہ اصل گھر یہ دنیا نہیں ہے۔ اصل گھر

آخرت ہے۔ جب تک وہ گوں نہ جیتا جائے اس وقت تک یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ کس کی جیت رہی اور کون ہارا۔ اس میں یہ اشارہ بھی مضمر ہے کہ اس دنیا میں مخالفین حق کو جو دندنانے کا موقع دیا جاتا ہے یہ اترانے کی چیز نہیں ہے، یہ عارضی ڈھیل ہے۔ کل انہیں پتہ چلے گا کہ اصل کامیابی کس کو حاصل ہوئی۔

انجام کار کی کامیابی ظالموں کے لیے نہیں

'انّہ لا یفلح الظالمون'۔ اوپر والے ٹکڑے میں جو بات مبہم رہ گئی تھی وہ اس ٹکڑے میں صاف کر دی گئی۔ اوپر یہ فرمایا تھا کہ تم دیکھ لو گے کہ عاقبت کار کی کامیابی کس کو حاصل ہوتی ہے۔ اب یہ بتا دیا کہ انجام کار کی کامیابی میں ان لوگوں کا کوئی حصہ نہیں ہے جو کافر و مشرک اور حق تلف و ناسپاس ہوں گے۔ یہ بات جس حقیقت پر مبنی ہے وہ یہ ہے کہ یہ کائنات اپنے وجود سے شہادت دیتی ہے کہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں ہے بلکہ یہ ایک حکیم و علیم اور عادل و رحیم کی پیدا کی ہوئی دنیا ہے پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ انجام کار کی کامیابی وہ ان لوگوں کو بخشے جو ظلم و شرک کے مرتکب ہوئے۔

بات اصولی رنگ میں

یہاں یہ پہلو خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ بات بالکل اصول کے رنگ میں فرمائی، من و تو کے انداز میں نہیں فرمائی۔ یہ نہیں فرمایا کہ انجام کار کی کامیابی ہمارا حصہ ہے یا آخرت میں فلاح ہم پائیں گے بلکہ صرف یہ فرمایا کہ آخرت کی فلاح میں ظالموں کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ اسلوب بیان حکمت دعوت کے نقطۂ نظر سے بھی نہایت موثر ہے اور یہ اس خشیت و توکل پر بھی دلیل ہے جو انبیاء و صالحین کے اندر ہوتی ہے۔ جو چیز پردۂ غیب میں ہے، جس کا فیصلہ ہونا ابھی باقی ہے، جس کی راہ میں ابھی معلوم نہیں کتنی دشوار گزار گھاٹیاں پار کرنی اور کتنی پر خطر وادیاں قطع کرنی ہیں اس کے باب میں جو بات کہی جا سکتی ہے وہ اسی حد تک کہی جا سکتی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر کوئی دعوے کرنا بندگی اور خشیت الٰہی کے خلاف ہے۔

وَجَعَلُوا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا
هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ
لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ
اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ۗ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ
لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ
لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ۚ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ
مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ۝ وَقَالُوْا هٰذِهٖ
اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ
وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ

عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ۚ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝ وَقَالُوْا
مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ
عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ۚ سَيَجْزِيْهِمْ
وَصْفَهُمْ ۚ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا
اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً
عَلَى اللّٰهِ ۚ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝ ۱۳۶-۱۴۰

مشرکین کی بدعات کی تفصیل

اس سلسلۂ بحث کا آغاز، جیسا کہ آیات ۱۱۸-۱۲۱ سے معلوم ہوا، مشرکین مکہ کی ان بدعات کی تردید سے ہوا تھا جو اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت انہوں نے تحریم و تحلیل کی نوعیت کی ایجاد کی تھیں۔ اس تردید کے جواب میں انہوں نے جو ہنگامۂ بحث و جدال کھڑا کیا اس کے تقاضے سے بیچ میں بعض مناسب حالات ہدایات مسلمانوں کو دی گئیں اور بعض ضروری تنبیہات مشرکین کو سنائی گئیں۔ اب یہ ان بدعات کی تفصیل آ رہی ہے تاکہ مسلمان اپنے آپ کو ان نجاستوں سے محفوظ رکھیں۔

'وجعلوا للّٰہ مما ذرأ من الحرث والانعام نصیبا فقالوا ھذا للّٰہ بزعمھم وھذا لشرکائنا' یعنی باغ، کھیتی، چوپائے سب پیدا تو کیے خدا نے لیکن ان ظالموں نے ان میں سے خدا کا جو حصہ نکالا تو اس طرح کہ دوسرے شریکوں کے ساتھ ایک حصہ خدا کے لیے بھی الگ کر دیا۔ 'ھذا للّٰہ بزعمھم وھذا لشرکائنا' یہ اسی تقسیم کی تفصیل ہے کہ اس میں سے اتنا حصہ تو خدا کا ہے اور اتنا حصہ ہمارے شریکوں اور معبودوں کا ہے۔ اس تقسیم کے متعلق فرمایا کہ 'بزعمھم' یہ تمام تر ان کے وہم و گمان پر مبنی بے دلیل دعویٰ ہے کہ یہ شریعت ابراہیمی کا حکم ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ مشرکین عرب نہ صرف خدا کو مانتے تھے بلکہ ہر چیز کا خالق بھی خدا ہی کو تسلیم کرتے تھے۔ اور اس کے نام کا ایک حصہ اپنی زمین پیداوار میں سے بھی اور اپنے گلوں میں سے بھی خیر خیرات اور نذر و نیاز کے لئے الگ کرتے تھے۔ یہ چیز ان کے اندر حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ کے زمانے سے چلی آ رہی تھی۔ چنانچہ حضرت اسمٰعیلؑ کے متعلق خود قرآن میں ہے 'وکان یامر اھلہ بالصلوٰۃ والزکوٰۃ' ۵۵-مریم (اور اپنے اہل و عیال کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا) بعد میں جب ان کے اندر مشرکانہ بدعات پھیلیں تو جس طرح خدا کے دوسرے حقوق میں ان کے فرضی معبود و شریک ساجھی بنے اسی طرح اس کے نام کی زکوٰۃ بھی انہوں نے اس کے فرضی شریکوں میں تقسیم کر دی کہ اس میں سے اتنا حصہ فلاں کا، اتنا حصہ فلاں کا۔

'فما کان لشرکائھم فلا یصل الی اللّٰہ وما کان للّٰہ فھو یصل الی شرکائھم'

ما یحکمون ٭ - یہ ان کے ستم بالائے ستم یا ان کی حماقت در حماقت کا بیان ہے کہ اگر کوئی مجبوری یا مشکل پیش آجائے تو خدا کا حصہ تو ان کے بتوں کی طرف منتقل ہو سکتا تھا لیکن مجال نہیں تھی کہ بتوں کا حصہ کسی حال میں خدا کی طرف منتقل ہو سکے گویا حق مرجح بتوں اور شریکوں ہی کا تھا۔ قرآن نے دوسری جگہ بیان فرمایا ہے کہ مشرکین اپنے معبودوں اور شریکوں سے خدا کے بالمقابل زیادہ محبت کرتے ہیں۔ یہ چیز کچھ مشرکین مکہ ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ تمام مشرک قوموں کی مشترک خصوصیت بلکہ خود شرک کی فطرت ہے۔ مشرکین جن چیزوں کو خدا کا شریک بناتے ہیں ظاہر ہے کہ اس خیال سے بناتے ہیں کہ ان کی تمام نقد ضروریات انہی سے وابستہ ہیں اور اگر خدا سے کوئی ضرورت وابستہ ہے بھی تو بہرحال وہ بھی انہی کی وساطت سے پوری ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر خدا نہ بھی پوری کرنی چاہے جب بھی اگر یہ چاہیں تو پوری کرا ہی لیتے ہیں۔ اس خیال کے ہوتے ظاہر ہے کہ خدا کی اہمیت کچھ باقی نہیں رہ جاتی۔ چنانچہ ان مشرکین کے نزدیک بھی خدا کی حیثیت نعوذ باللہ گھر کے ایک بڑے بوڑھے ناکارہ وجود سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی۔ چنانچہ وہ اسی حیثیت سے اس کے ساتھ معاملہ بھی کرتے تھے۔ اس کے نام پر روایت کے تحت کچھ نکال تو دیتے لیکن اگر اتفاق سے کسی بت کے نام کی بکری مر گئی یا چوری ہو گئی یا اس کے نام کا غلہ چوہے کھا گئے تو اس کی تلافی لازماً خدا کے حصے میں سے کر دی جاتی اور اگر اسی قسم کی کوئی آفت خدا کے نام پر نکالے ہوئے حصہ پر آجاتی تو یہ ممکن نہ تھا کہ اس کی تلافی معبودوں کے حصے کے مال سے کرنے کی جرأت کریں۔ فرمایا کہ 'کتنا برا فیصلہ ہے جو یہ کرتے ہیں'! اول تو سب کچھ بخشا ہوا خدا کا اور اس کے حصہ میں یہ من مانا بٹوارہ! پھر فرضی معبودوں کی یہ ناز برداری اور معبود حقیقی سے یہ بے پروائی اور اس کی یہ ناقدری! -

'وکذٰلک زین لکثیر من المشرکین قتل اولادھم شرکاؤھم' - یعنی ان کے یہ شرکاء صرف مالوں ہی میں حصہ دار نہیں ہیں بلکہ خدا کی بخشی ہوئی جانوں میں بھی حصہ دار بنا دیئے گئے ہیں۔ بہت سے مشرکین ان کی خوشنودی کے لیے اپنی اولاد بھی ان کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ ہم آیت ... کے تحت بیان کر آئے ہیں کہ یہ سنگین جرم بعض مزعومہ سرکش جنی بھوتوں کو راضی رکھنے کے لئے کیا جاتا تھا۔ غالباً سخت قسم کے جاہل مشرکین اس وہم کے تحت کہ فلاں وادی　　یا فلاں درخت کے جن کو انہوں نے اپنی کسی اولاد کی نذر دے کر راضی نہ رکھا تو وہ ان کی ساری اولاد یا ان کے سارے خاندان پر آفت لائے گا یہ حرکت کرتے تھے۔ اس قسم کے اوہام تمام مشرک اور وہم پرست قوموں کے اندر پہلے بھی موجود رہے ہیں اور زمانہ کی ترقی کے باوجود اب بھی بعض قوموں کے نچلے طبقات میں پائے جاتے ہیں۔ ان اوہام کے پختہ کرنے میں شیاطین جن کے ان ایجنٹوں کو بڑا دخل ہوتا ہے جو انسانوں میں سے ان کے مرید بن جاتے ہیں۔ عرب

غلط معبودوں کی خوشنودی کے لئے قتل اولاد

جاہلیت میں جہاں جہاں بھوتوں کے تھان اور استھان تھے ان کے پروہت، کاہن اور مجاور اپنی طرف سے گھڑ کر ان سادہ لوحوں کو ورغلاتے کہ فلاں جن تم پر بڑا غضب ناک ہے، اگر تم نے اپنے کسی بیٹے کی قربانی دے کر اس کو راضی نہ کیا تو وہ تمہارے سارے خاندان کو چٹ کر جائے گا۔ بیوقوف لوگ اس کے جھانسے میں آکر یہ بیہودہ اور سنگدلانہ جرم کر بیٹھتے اور اس طرح اپنے دین اور اپنی دنیا دونوں برباد کرتے۔

دین اور دنیا دونوں کی بربادی

[illegible] 'ولیلبسوا علیھم دینھم' - 'دینھم' (ان کے دین) سے مراد وہ دین ہے جو ان کو حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ سے وراثت میں ملا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ شیاطین جن و انس نے سادہ لوحوں اور کم عقلوں کو اس جال میں پھنسا کر ان کو مادی و روحانی دونوں قسم کی ہلاکتوں میں مبتلا کیا۔ ایک طرف ان کو اولاد جیسی نعمت سے محروم کیا، دوسری طرف ابراہیمؑ کا سکھایا ہوا سیدھا سادا فطری دین ان کے لئے ایک گورکھ دھندا بن کے رہ گیا۔

ہدایت و ضلالت کے باب میں سنت الٰہی

'ولو شاء اللہ ما فعلوہ فذرھم وما یفترون' - یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ہے کہ اگر یہ اپنی ان حماقتوں اور سنگدلانہ حرکتوں کی حمایت میں تم سے لڑتے جھگڑتے ہیں، تمہاری بات سننے کے لئے تیار نہیں ہیں تو ان کو ان کے من گھڑت فتنوں میں پڑے رہنے دو۔ تمہارا کام کسی کو زبردستی راہ پر لگانا نہیں ہے۔ اللہ نے اس دنیا میں باطل کو بھی مہلت دی ہے۔ جو باطل پر جمے رہنا چاہتے ہیں خدا ان کو ان کے باطل ہی پر چھوڑ دیتا ہے۔ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں اس نے جبر کو پسند نہیں فرمایا ہے۔ اگر وہ اپنی مشیت کے زور سے لوگوں کو ہدایت پر لانا چاہتا تو یہ سب ہدایت پر ہوتے، کوئی بھی اس گمراہی پر جما نہ رہ سکتا۔ جب یہ سنت الٰہی ہے تو تم ان کی اس ہٹ دھرمی سے کیوں پریشان ہو! -

بتوں کے پجاریوں کی من گھڑت شریعت

'وقالوا ھٰذہ انعام وحرث حجر لا یطعمھا الا من نشاء بزعمھم' - 'حجر' کے معنی ممنوع کے ہیں لیکن یہ لفظ عرب جاہلیت کی ایک دینی اصطلاح ہے۔ اس سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جو کسی دینی رسم کے تحت ممنوع (TABOO) ہو۔ اسلامی اصطلاح اس کے لئے حرام کی ہے۔ یہ ان کے تھانوں اور استھانوں کے پروہتوں اور مجاوروں کے من گھڑت فتوے نقل ہو رہے ہیں۔ ان کے ہاں زمینی پیداوار اور چوپایوں کے جو چڑھاوے پیش ہوتے ان کے کھانے کے باب میں چڑھاوے کی نوعیت کے اعتبار سے بڑی بڑی قیدیں اور پابندیاں تھیں۔ مثلاً مرد کھا سکتے ہیں، عورتیں نہیں کھا سکتیں، یا بیوہ کھا سکتی ہے سہاگن یا کنواری نہیں کھا سکتی یا اس کے برعکس۔ اس قسم کی حماقتیں ہمارے ہاں بھی بہتیری گھرانوں میں پائی جاتی ہیں۔ یہ فتوے چونکہ تمام تر ان پروہتوں کی خود ساختہ شریعت پر مبنی تھے اور وہی اس کے عالم بھی تھے اس وجہ سے نہ کوئی دوسرا اس میں اپنا کوئی [illegible] لگا سکتا تھا نہ سر مو اس سے انحراف اختیار کر سکتا تھا۔ ان کے اسی تحکم کو 'الا من نشاء بزعمھم

کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

"وانعام حرمت ظہورها وانعام لا یذکرون اسم اللہ علیها افتراء علیہ"۔ بعض قسم کے جانوروں پر سواری کرنا ناجائز تھا۔ اس کی بعض مثالیں مائدہ آیت ۱۰۳ کے تحت گزر چکی ہیں۔ بعض قسم کی نذروں اور چڑھاووں پر ان کے ذبح کے وقت خدا کا نام نہیں لیتے تھے۔ یہ ملحوظ رہے کہ اہل عرب ملت ابراہیم کی روایات کے زیر اثر ذبح کے صحیح طریقے سے آشنا تھے اور ذبح کے وقت وہ خدا کا نام بھی لیتے تھے لیکن مشرکانہ رسوم و عقائد کے غلبہ نے ان کو اس طریقہ سے ہٹا کر ایک بالکل غلط راہ پر ڈال دیا۔ ازاں جملہ یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ بعض قسم کے چوپایوں پر وہ خدا کا نام لینا اپنی مشرکانہ شریعت کے خلاف سمجھتے تھے۔ ان کی یہ ساری خرافات مبنی تو تھیں ان کے مشرکانہ اوہام پر لیکن جس طرح وہ اپنی ساری ہی حماقتوں کو اللہ کی تعلیم کی طرف منسوب کرتے اسی طرح ان حماقتوں کو بھی اللہ کی طرف منسوب کرتے تھے اس وجہ سے قرآن نے اس کو افترا سے تعبیر فرمایا اور دھمکی دی کہ اللہ عنقریب ان کو اس افترا کی سزا دے گا۔

"وقالوا ما فی بطون ھذہ الانعام خالصۃ لذکورنا و محرم علی ازواجنا وان یکن میتۃ فھم فیہ شرکاء"۔ یہ بھی انہی خانہ ساز فتووں کے قسم کی ایک بات ہے۔ بعض چوپایوں کے پیٹ سے پیدا ہونے والے بچوں کے متعلق مشرکانہ توہمات کے تحت ان کا فتویٰ یہ تھا کہ مردوں کے لیے ان کا کھانا جائز ہے، عورتوں کے لئے ناجائز۔ ہاں اگر بچہ مردہ پیدا ہو تو اس کے کھانے میں مرد و عورت دونوں شریک ہو سکتے ہیں۔ فرمایا کہ "سیجزیھم وصفھم انہ حکیم علیم" یہ جو من مانے فتوے دیئے جا رہے ہیں اللہ ان کو عنقریب اس کا بدلہ دے گا۔ اس کے علم و حکمت کے یہ بات منافی ہے کہ وہ ان لوگوں کو سزا نہ دے جو اس جسارت کے ساتھ اس کے نام پر شریعت سازی کے کارخانے کھول لیں۔ اس میں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ ان لوگوں سے نمٹنے میں جو دیر ہو رہی ہے یہ اس کے علم و حکمت پر مبنی ہے۔ خدا کے ہاں دیر ہے لیکن اندھیر نہیں۔

"قد خسر الذین قتلوا اولادھم سفھا بغیر علم و حرموا ما رزقھم اللہ افتراء علی اللہ"۔ یہ ان تمام حماقتوں پر جو اوپر مذکور ہوئیں اور ان کے مرتکبین کی بد انجامی پر اظہار افسوس ہے کہ بغیر کسی خدائی سند کے محض حماقت سے اللہ پر افترا کر کے انہوں نے اپنی اولادوں کو قتل کیا اور اللہ کے بخشے ہوئے رزق کو اپنے اوپر حرام کیا۔ ان کی بدبختی و نامرادی میں کیا شبہ کی گنجائش ہے۔ یہ لوگ راہ حق سے بھٹکے اور اللہ نے اپنے پیغمبر کے ذریعہ سے ان کو اپنی راہ دکھائی تو اپنی بدبختی کے سبب سے اس کو اختیار کرنے والے نہ بنے۔ "قد ضلوا وما کانوا مھتدین"۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین
ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

منشورِ اسلام

(۳)

ایک غلط نصب العین کو چھوڑ کر دوسرے غلط نصب العین سے محبت کرنا

محض یہ سمجھ لینا یا اطلاع رکھنا کہ فلاں نصب العین حسین ہے کسی انسان کے دل میں اس نصب العین کی محبت پیدا نہیں کر سکتا۔ ایک نصب العین کی محبت صرف اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب اس کے حسن کو فی الواقع محسوس کیا جائے۔ ضروری ہے کہ ایک دریا جس کے راستہ میں رکاوٹ پیدا کر دی گئی ہو اپنا راستہ بدلے اور زمین کی اس سطح پر بہنا شروع کر دے جو اس کے لئے اپنی خاص بلندی کی وجہ سے قبول کر سکتی ہو خواہ اس کے نتائج کھیتوں اور انسانی آبادیوں کے لئے کچھ ہوں۔ اسی طرح سے جو انسان اپنے صحیح نصب العین کے حسن کو محسوس نہ کر سکے، ضروری ہے کہ اس کے جذبہ حسن کا زور دار بہاؤ اپنا فطری راستہ بدل لے اور ایک ایسے تصور حسن کی راہ سے اپنا اظہار کرنے لگ جائے جو حسین تو نہیں لیکن جس کا فرضی حسن وہ اپنی نادانی اور علمی بے مائیگی کی وجہ سے اسی طرح محسوس کرتا ہے جس طرح سے بیابان میں ایک پیاسا سراب کو پانی سمجھتا ہے۔

ایسے انسان کے ساتھ جو ماجرا پیش آتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کو اس تصور میں حسن کی بعض صفات ایک جھلک صاف طور پر نظر آتی ہے لہذا ان صفات کی کشش کی وجہ سے اور اپنے جذبۂ محبت کی مکمل تشفی کی غرض سے وہ اس پورے تصور کو اپنا نصب العین بنا کر اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا کرتے ہوئے وہ نادانستہ طور پر اور پورا غور و فکر کرنے کے بغیر یہ فرض کر لیتا ہے کہ اس کے اندر وہ تمام صفات حسن موجود ہیں جن کی آرزو اس کی فطرت میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس تصور کی طرف حسن کی باقی ماندہ صفات کو (جن کی جھلک اس کو اس تصور میں نظر نہیں آتی تھی اور جن کو وہ شعوری طور پر اس کی طرف منسوب نہیں کر سکتا تھا) غیر شعوری طور پر منسوب کرتا ہے تاکہ اپنی غلطی کو مکمل

کرکے اپنی آرزوئے حسن کی تشفی کا سامان پیدا کرے۔ دوسرے لفظوں میں وہ اسے غلطی سے صحیح نصب العین یعنی خدا سمجھ لیتا ہے اور لہذا اُسے دل و جان سے چاہنے لگتا ہے اور اس سے ویسی ہی محبت کرتا ہے۔ اس کی ویسی ہی خدمت کرتا ہے ویسی ہی ستائش کرتا ہے اور ویسی ہی پرستش کرتا ہے جیسی کہ خدا کے لئے ہونی چاہیئے۔ قرآن حکیم نے انسان کی فطرت کے اس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ومن الناس من یتخذ من دون اللہ انداداً یحبونھم
کحب اللہ والذین آمنوا اشد حبا للہ (سورۂ بقرہ: رکوع ۲۰)

(لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو خدا کو چھوڑ کر اوروں کو معبود بنا لیتے ہیں اور پھر اُن سے ویسی ہی محبت کرتے ہیں جیسی خدا سے کرنی چاہیئے۔ اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں خدا سے شدید محبت رکھتے ہیں)

تاہم وقت کے گزرنے سے جب اس تصور کے ساتھ اس کا میل جول بڑھتا ہے اور اپنے آپ کے متعلق (یعنی اس بات کے متعلق کہ اس کے جذبہ محبت کا تسلی بخش اور صحیح مقصود کیا ہو سکتا ہے یا کیا ہونا چاہیئے) اس کا علم ترقی کرتا ہے تو تصور کے نقائص اس پر عیاں ہونے لگتے ہیں۔ یہ نقائص حسن کے ان اوصاف کے ساتھ ٹکراتے ہیں اور ان کی نفی کرتے ہیں جن کو وہ اس تصور کی طرف شعوری طور پر منسوب کر رہا تھا لہذا وہ ایک تلخ تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اس تصور کے اندر جس کو اُس نے اپنا نصب العین بنا لیا تھا، درحقیقت حسن کا کوئی وصف بھی موجود نہیں اور وہ یہ سمجھنے میں غلطی پر تھا کہ اس کو اس تصور کے اندر صفات حسن کی کوئی جھلک صاف طور پر نظر آتی ہے۔

اس انکشاف حقیقت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس نصب العین کو کلیۃً ترک کر دیتا ہے اور فی الفور ایک اور نصب العین کو اختیار کرتا ہے جو اُس کے خیال میں اُن نقائص سے مبرّا ہوتا ہے جو اس کے پہلے نصب العین میں موجود تھے اور اُن صفات حسن سے مزین ہوتا ہے جو پہلے نصب العین میں موجود نہیں تھے۔ لیکن اگر اس عرصہ میں موافق قسم کی تعلیم یا صحبت پانے کی وجہ سے اس کے دل میں اپنی فطرت کے صحیح نصب العین کے حسن کا احساس پیدا نہ ہو چکا ہو تو ضروری بات ہے کہ اس کا یہ نیا نصب العین بھی غلط ہو۔ اس صورت میں اگرچہ اُسے یقین ہوتا ہے کہ اس کا نیا نصب العین ان نقائص سے مبرّا ہے جو اس کے پہلے نصب العین میں موجود تھے تاہم اس میں بعض اور نقائص موجود ہوتے ہیں جن کا اُسے علم نہیں ہوتا اور یہ نقائص بعد میں اس کی ایک اور شکست خوردگی اور ایک اور مایوسی کا باعث ہوتے ہیں۔ تجزیہ اور خطا کا یہ عمل جس میں ایک غلط نصب العین کا انتخاب کیا جاتا ہے اس سے والہانہ محبت کی جاتی ہے۔ اس کے نقائص کا احساس کیا جاتا

ہے اسے ترک کیا جاتا ہے اور پھر ایک اور غلط نصب العین کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ انسان صحیح نصب العین کا انتخاب نہیں کرتا۔ ایک انسان کے اندازۂ حسن میں ایک نصب العین کا گرنا اور دوسرے کا ابھرنا۔ ایک ہی سلسلے کے ایک سرے کے گرنے اور دوسرے سرے کے ابھرنے کی طرح بیک وقت عمل میں آتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب ایک آدمی ایک نصب العین کو چھوڑ رہا ہوتا ہے تو اس وقت وہ دوسرے نصب العین سے محبت کر رہا ہوتا ہے۔ جب بھی ایک نصب العین کو چھوڑنے اور دوسرے کو اختیار کرنے کے درمیان ایک وقفہ آجائے تو خواہ وہ کتنا ہی مختصر ہو، اس سے انسان کا دوران جذبۂ محبت رک جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ صدمہ سے مر جاتا ہے۔ یا کسی شدید قسم کے اعصابی یا دماغی مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ذہنی بیماریوں کا سبب انسان کے جذبہ محبت کی رکاوٹ ہے۔

نصب العینوں کی خصوصیتیں

اس سے پہلے کہ غلط نصب العینوں سے محبت کرنے کے خطرناک نتائج اور صحیح نصب العین سے محبت کرنے کی برکتوں کا جائزہ لیا جائے۔ ضروری ہے کہ نصب العین کی محبت کے فطری جذبہ کی کچھ اور خصوصیتیں بیان کی جائیں اور یہ بتایا جائے کہ نصب العین سے محبت کرنے والے افراد پر نصب العین کی محبت کے اثرات کیا ہوتے ہیں۔

فلسفۂ اخلاق کی بنیاد

چونکہ ایک انسان جانتا ہے کہ اُسے اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے کیا کرنا چاہیئے اور کیا نہیں کرنا چاہیئے وہ اپنے نصب العین سے ایک ضابطہ اخلاق یا سلسلہ اوامر و نواہی کا استخراج کرتا ہے۔ وہ نصب العین کی محبت کی وجہ سے اس ضابطہ اخلاق پر نہایت آسانی سے اور پوری رضامندی سے عمل کرتا ہے۔ اس کے نزدیک اپنے نصب العین کے ضابطہ اخلاق کے سوا کسی اور ضابطہ اخلاق کی اپنی کوئی اہمیت اور قیمت نہیں ہوتی۔ یہ ضابطہ اخلاق اس کی زندگی کے تمام اعمال و افعال کو اپنے ضبط میں رکھتا ہے خواہ وہ اعمال و افعال اخلاق سے تعلق رکھتے ہوں یا سیاست سے یا اقتصاد سے یا معاشرت سے یا تعلیم سے یا قانون سے یا فن سے یا علم سے یا حربی معاملات سے۔

نظریہ جات کی اساس

جب ایک نصب العین کو ماننے والی جماعت اپنے نصب العین کو

اپنی قدرتی عملی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر چسپاں کرتی ہے تو افکار و تصورات کا جو نظام اس عمل کے دوران پیدا ہوتا ہے اُسے اس کے نظری پس منظر کے سمیت نظریۂ حیات یا آئیڈیالوجی کہا جاتا ہے۔ ایک نصب العین پر اس طرح سے مبنی ہونے والا نظریۂ حیات صرف اسی حد تک مکمل ہوتا ہے جس حد تک کہ وہ انسان کی قدرتی عملی زندگی کے تمام ضروری پہلوؤں پر حاوی ہو۔ لیکن جس حد تک کہ وہ نظریۂ حیات انسان کی قدرتی عملی زندگی کے بعض پہلوؤں کو نظر انداز کرتا ہے اور اس بات کی تشریح اور توضیح نہیں کرتا کہ جس نصب العین پر وہ مبنی ہے وہ زندگی کے ان پہلوؤں پر عملی لحاظ سے کس طرح اثر انداز ہوگا۔ اُس حد تک وہ نظریۂ حیات نامکمل رہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بہت سے ایسے نظریات حیات ممکن ہیں جو مکمل نصب العین پر مبنی ہوں لیکن خود نامکمل ہوں اور اسی طرح سے بہت سے ایسے نظریات حیات بھی ممکن ہیں جو نامکمل نصب العینوں پر مبنی ہوں لیکن خود مکمل ہوں یہ دونوں قسم کے نظریات حیات فطرت انسانی کے لئے ناتسلی بخش ہیں۔ تسلی بخش نظریۂ حیات وہی ہو سکتا ہے جو (ا) مکمل نصب العین پر مبنی ہو اور (ب) خود بھی مکمل ہو۔

فلسفہ کی اساس

ہر نصب العین اپنے چاہنے والے کے لئے انسان اور کائنات کے متعلق تمام ممکن سوالات کا جواب مہیا کرتا ہے لہٰذا ہر نصب العین بالقوہ ایک فلسفۂ کائنات ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ فلسفہ جس نصب العین پر مبنی ہو اس کے درست ہونے کے باوجود اس کو کسی خاص وقت تک کوئی ایسا ماہر فلسفی دستیاب نہ ہوا ہو جو اس کو ایک نظامِ حکمت کی شکل دے سکے یا اس فلسفہ کا بنیادی نصب العین اس قدر غلط یعنی فطرت انسانی سے اس قدر نامطابق ہو کہ اس کے اندرونی تناقض اور تضادات کی وجہ سے کسی ماہر فلسفی کے لئے ممکن ہی نہ ہو کہ وہ اس کو ایک معقول اور مدلل نظام حکمت کی شکل دے سکے۔ کیونکہ جس حد تک کوئی نصب العین فطرت انسانی سے غیر مطابق ہوتا ہے وہ فلسفہ بھی جو اس سے نکلتا ہے یا اس کے اندر مضمر ہوتا ہے غلط اور نامعقول اور بے ربط ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ صحیح مکمل اور مربوط فلسفۂ کائنات صرف وہی ہو سکتا ہے جو اس مکمل نظریۂ حیات کی علمی اور عملی تشریح کر سکے جو ایک مکمل نصب العین پر مبنی ہو۔ لہٰذا جوں جوں علم ترقی کرتا جاتا ہے وہ فلسفہ جو کسی غلط نصب العین پر مبنی ہو اپنی معقولیت اور قوت کھوتا جاتا ہے یہاں تک کہ سب لوگ تسلیم کر لیتے ہیں کہ وہ غلط ہے اور وہ فلسفہ جو صحیح نصب العین پر مبنی ہو زیادہ سے زیادہ معقول اور مدلل ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ سب لوگ مان لیتے ہیں کہ وہ صحیح ہے۔ یہی سبب ہے کہ مکمل نصب العین پر مبنی ہونے والا غیر مکمل نظریۂ حیات کبھی کائنات کے ایک صحیح اور معقول فلسفہ کی صورت اختیار نہیں کر سکتا۔ ایک

سچا فلسفہ ہمیشہ بالقوہ ایک مکمل فلسفہ ہوتا ہے جو بالفعل ہو کر انسان کی قدرتی عملی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو جاتا ہے اور اُن کی پوری تشریح اور توضیح کرتا ہے۔

نصب العین کی وحدت

انسان کی فطرت اس طرح سے بنائی گئی ہے کہ آخر کار کوئی انسان بیک وقت ایک سے زیادہ نصب العینوں کے ساتھ محبت نہیں کر سکتا۔ ایک بچہ ایک ہی وقت میں بہت سے متضاد تصورات کے زیر اثر ہوتا ہے۔ اُس کے افعال کبھی ایک تصور کے ماتحت اور کبھی دوسرے تصور کے ماتحت ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ جوں جوں اس کی عمر اور اس کے تجربہ میں اضافہ ہوتا جاتا ہے وہ زیادہ سے زیادہ اس قابل ہوتا جاتا ہے کہ ان تصورات کا مقابلہ ایک دوسرے سے کر کے یہ دیکھے کہ ان میں سے کون سا تصور ایسا ہے جسے وہ درحقیقت چاہتا ہے اور جس کے لئے اُسے دوسرے تصورات کے تقاضوں کو قربان کرنا چاہیے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بالآخر وہ ایک کے سوائے باقی تمام تصورات کو رد کر دیتا ہے اور یہ تصور اس کا نصب العین اور اس کی ذات کا مرکز فکر و عمل بن جاتا ہے اور اس کی شخصیت کو متحد اور منظم کر دیتا ہے۔

اگر کوئی شخص ایسا ہو جو یہ سمجھتا ہو کہ وہ دو نصب العینوں سے بیک وقت محبت کر سکتا ہے اور کر رہا ہے مثلاً عیسائیت اور انگریزی وطنیت کے نصب العینوں سے۔ تو جونہی کہ اُس کو ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑے گا جن میں ان دونوں نصب العینوں کے تقاضے ایک دوسرے کے خلاف ہوں گے اس کی یہ غلط فہمی دور ہو جائے گی۔ اُسے معلوم ہو جائے گا کہ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک نصب العین کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے دوسرے نصب العین کے تقاضوں کو نظر انداز کرے اور یہ کہ اگرچہ وہ سمجھتا تھا کہ وہ بیک وقت دو نصب العینوں سے برابر کی محبت کر رہا ہے تاہم اصل حقیقت یہ تھی کہ ان میں سے ایک نصب العین دوسرے کا محکوم اور خدمت گزار تھا۔ جب کوئی شخص سچ مچ بیک وقت دو یا تین مختلف نصب العینوں سے محبت کر رہا ہو تو اس کا مطلب سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوتا کہ اسے اپنے آپ کا علم اس قدر کم ہے کہ وہ وضاحت سے نہیں جانتا کہ جن نصب العینوں سے وہ محبت کر رہا ہے وہ اُس سے عملی طور پر کیا چاہتے ہیں کیونکہ دو مختلف نصب العینوں کے عملی تقاضے کبھی ایک نہیں ہوتے۔ مثلاً ایک فرد انسانی کے لئے ناممکن ہے کہ وہ بیک وقت ایک اچھا عیسائی اور ایک اچھا کمیونسٹ یا ایک اچھا مسلمان اور ایک اچھا وطنیت پرست بن سکے ایک انسان کا سیاسی نصب العین اس کی پوری عملی زندگی پر حاوی ہوتا ہے۔ جب کوئی مذہب یا کوئی فلسفہ جس پر وہ یقین رکھتا ہو اُس کا سیاسی نظریہ نہ ہو تو پھر وہ ایک ایسے عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے جو اُس کے سیاسی نظریہ کے ماتحت

رہتا ہے جو خود اس کے اعمال و افعال کو معین نہیں کرتا اور جس کے عملی تقاضے وہ وقتاً فوقتاً اپنے سیاسی نظریہ کی خاطر پامال کرتا رہتا ہے۔

سیاست، اقتصاد، تعلیم اور قانون کی بنیاد

ایک فرد کا نصب العین بالعموم بہت سے افراد کا نصب العین بن جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ والدین اپنے نصب العین کی محبت اپنی اولاد کو منتقل کرتے ہیں اور ان کی اولاد گھر کے تعلیمی ماحول کی وجہ سے اس محبت کو اپنے والدین سے غیر شعوری طور پر اخذ کرتی ہے۔ جس طرح زندگی زندگی کو پیدا کرتی ہے اسی طرح سے محبت محبت کو پیدا کرتی ہے کیونکہ محبت دراصل زندگی ہی ہے جو کائنات کی نفسیاتی سطح پر نمودار ہوتی ہے۔

وہ افراد جو ایک ہی نصب العین سے محبت رکھتے ہوں ایک دوسرے کی طرف کشش محسوس کرتے ہیں اور ہم خیال لوگوں کی ایک جماعت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ جماعت قدرتی طور پر خاندان کے کسی بزرگ یا قبیلہ کے کسی سردار یا کسی بادشاہ یا قائد یا ڈکٹیٹر یا پریذیڈنٹ کے ماتحت منظم ہو جاتی ہے۔ ہر منظم جماعت کسی نہ کسی نصب العین پر مبنی ہوتی ہے اور ہر نصب العین جو زندہ رہتا ہے آخر کار ایک منظم جماعت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ نصب العین کی محبت ماحول کے اثر سے جس میں والدین، بزرگ، استاد، دوست، اخبار، کتابیں، رسالے، ریڈیو، ٹیلی ویژن وغیرہ شامل ہیں۔ قوم کی آئندہ نسلوں کو منتقل ہوتی رہتی ہے اور اس کی روح کے طور پر قائم رہتی ہے۔ یہ ہے وہ طریق جس سے ایک نظریاتی جماعت خواہ اس کا نظریہ صحیح ہو یا غلط صدیوں تک زندہ رہتی ہے۔ زمانۂ حال کی منظم نظریاتی جماعتوں کو ریاستیں کہا جاتا ہے۔

ایک نظریاتی جماعت یا ریاست کے تمام اعمال و افعال خواہ وہ سیاسی ہوں یا فوجی یا اقتصادی۔ یا معاشرتی یا اخلاقی یا قانونی یا علمی یا تعلیمی یا فنی اس کے نصب العین کے ضابطۂ اخلاق سے معین ہوتے ہیں۔

ایک منظم نظریاتی جماعت یا ریاست ایک زندہ جسم حیوانی کی طرح ہوتی ہے جس میں نصب العین کی محبت قوت حیات کا کردار ادا کرتی ہے اور قائد دماغ کا اور حکومت کے محکمے اس کے اعضائے رئیسہ کا کام دیتے ہیں۔ ایک نظریاتی جماعت کے افراد جس قدر زیادہ اپنے نصب العین سے محبت رکھتے ہوں، اسی قدر زیادہ ان کی جماعت متحد اور منظم اور طاقتور ہوتی ہے اور محنت اور قابلیت سے کام کرنے کی استعداد رکھتی ہے۔

فرد کے نصب العینوں کا ارتقا

نصب العین کی محبت کا جذبہ فرد کی زندگی میں ابتدا ہی سے اپنا کام کرنے لگ جاتا ہے اور اس کا نتیجہ

یہ ہوتا ہے کہ جوں جوں اس کی عمر ترقی کرتی جاتی ہے اور اس کے علم اور تجربہ میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اس کے نصب العین بھی صحیح نصب العین کی سمت میں بدلتے اور ارتقا کرتے جاتے ہیں۔

ایک بچے کے لئے سب سے زیادہ تسلی بخش اشیا وہ ہوتی ہیں جو اس کی جبلتی یا حیوانی خواہشات مثلاً کھانے پینے، مالک بننے، برتر اور غالب ہونے، مل کر کھیلنے، تعمیر کرنے وغیرہ کی خواہشات کی تشفی کرتی ہیں لہٰذا اس کی صورت میں نصب العین کی محبت کا جذبہ ایسی اشیاء کی محبت کی شکل اختیار کرتا ہے۔ جب بچے کی عمر ذرا اور بڑھ جاتی ہے تو چونکہ اس کے والدین تمام دوسرے افراد کی نسبت اس سے زیادہ قریب ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ ان کو اچھی طرح سے جان لیتا ہے اور چونکہ وہ دیکھتا ہے کہ وہ اس کے بالمقابل ہر لحاظ سے بلند اور بالا اور برتر ہیں لہٰذا وہ ان کو اعلیٰ اور قابل ستائش ہستیاں سمجھنے لگتا ہے۔ اور وہ اس کا نصب العین بن جاتے ہیں لہٰذا وہ ان کی رضامندی یا پسندیدگی کی تمنا کرنے لگتا ہے اور اس کو حاصل کرنے کے لئے اس بات پر آمادہ ہو جاتا ہے کہ اپنے کردار کو مناسب قسم کے ضبط میں لائے اور جب بھی ضرورت پڑے اپنی جبلتی یا حیوانی خواہشات کو جو کبھی خود اس کا نصب العین بنی ہوئی تھیں اس نئے نصب العین کی خاطر قربان کر دے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد جب وہ اپنے اسکول کے استادوں کے ساتھ راہ و رسم پیدا کرتا ہے تو اس کے دل میں ان کی محبت اور ستائش کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ ان کو اچھائی اور کمال کا نمونہ سمجھنے لگتا ہے۔ آگے چل کر اس کی محبت کا جذبہ استادوں سے بھی برتر اور بلند تر اشخاص کی محبت کے راستے سے اپنا اظہار پانے لگتا ہے اور وہ قوم کے وہی عظیم افراد ہوتے ہیں جو اپنی مختلف حیثیتوں میں قوم کے راہنماؤں اور خدمت گذاروں کے طور پر پوری قوم سے خراج تحسین وصول کر چکے ہوتے ہیں۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اسے محسوس ہوتا ہے کہ ان عظیم اشخاص کی محبت جو اس کے دل میں پیدا ہوئی ہے اس کا باعث یہ ہے کہ وہ حسن، نیکی اور صداقت کے بعض اوصاف حمیدہ مثلاً رحم، ہمدردی، محبت، سخاوت، علم، دلیری، دیانتداری اور انصاف سے آراستہ ہیں۔ لہٰذا جس چیز سے درحقیقت اس کو محبت ہے وہ یہی اوصاف ہیں نہ کہ وہ افراد جن کی طرف یہ اوصاف منسوب کئے جاتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا نصب العین اشیا اور اشخاص سے گزر کر ان تصورات پر آ جاتا ہے جو اس کے خیال میں ان اوصاف کے حامل ہوتے ہیں۔ مثلاً عیسائیت۔ جمہوریت، قومیت، انسانیت، اشتراکیت، فسطائیت وغیرہ۔

فرد کے نصب العین کے ارتقا کے ساتھ اس کے دائرہ محبت کی توسیع کچھ اس ترتیب سے انجام پاتی ہے سب سے پہلے اسے فقط اپنی ذات سے محبت ہوتی ہے پھر وہ اپنی ذات کو چھوڑ کر اپنے پورے خاندان سے محبت کرنے لگتا ہے اور خاندان کی خاطر اپنی ذات کو قربان کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے پھر اس کی محبت کا

دائرہ اور وسیع ہو جاتا ہے اور اس میں خاندان ہی نہیں بلکہ اس کے دوسرے رشتہ دار اور دوست بھی داخل ہو جاتے ہیں آخرکار پوری قوم بلکہ وہ تمام افراد جو اس کے نصب العین کو چاہتے ہیں اس کی محبت کا مقصود بن جاتے ہیں۔ ابتداءً ایک فرد کے دل میں بہت سے ایسے نصب العینوں کی محبت جاگزیں ہوتی ہے جو ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو موجود ہوتے ہیں اور جو اس کی شخصیت کو اور اس کی عملی زندگی کو بہت سے الگ الگ بلکہ متضاد حصوں میں تقسیم کئے ہوئے ہوتے ہیں لیکن جب رفتہ رفتہ اس کے ذہن میں ان نصب العینوں کا مقابلہ اور موازنہ ایک دوسرے سے ہونے لگتا ہے تو بالآخر ایک وقت ایسا آجاتا ہے جب وہ یہ فیصلہ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے کہ ان میں سے ایک سب سے اچھا اور سب سے اونچا ہے اور یہ فیصلہ اس کی شخصیت کو ایک مرکز بہم پہنچا کر متحد اور منظم کر دیتا ہے۔ اور اس کی عملی زندگی میں بھی ایک مرکزیت یا وحدت پیدا کر دیتا ہے۔

ایک فرد انسانی کے نصب العینوں کا ارتقا ٹھوس اشیاء سے تصوری حقائق کی سمت میں۔ غیر مستقل سے مستقل کی سمت میں۔ غیر مکمل سے مکمل کی سمت میں۔ متعدد سے واحد کی سمت میں۔ جزو سے کل کی سمت میں اور حسن، نیکی اور صداقت کے پست درجوں سے بلند تر درجوں کی سمت میں ظہور پذیر ہوتا ہے اور جب ہم اس بات کو سامنے رکھیں کہ اس کا ارتقا صحیح نصب العین کی سمت میں ہوتا ہے اور ان کے ارتقا کی یہ سمتیں بالکل صحیح اور قدرتی نظر آتی ہیں تاہم ایک شخص کے نصب العین کا ارتقا بالعموم اُس قوم کے نصب العین پر آکر رک جاتا ہے جس کا وہ ایک رکن ہوتا ہے۔ شاذ ہی ایسا ہوتا ہے کہ کسی شخص کا نصب العین اُس قوم کے نصب العین سے اونچا ہو جائے جس میں وہ جنم لیتا ہے۔ ایسا شخص اگر دوسروں کو اپنے نصب العین کے حسن و کمال کا معترف نہ بنا سکے تو اس کی قوم کے لوگ اسے ایک دیوانہ یا باغی یا انقلابی سمجھتے ہیں اور اُسے دبانے اور مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔

جماعت اسلامی کے ماضی وحال کا تجزیہ

تحریک جماعت اسلامی

ایک تحقیقی مطالعہ

تالیف : ڈاکٹر اسرار احمدؒ

صفحات ۲۲۶ ، طباعت آفسٹ، مجلد مع ڈسٹ کور۔ قیمت چار روپے (محصول ڈاک علاوہ)

دارالاشاعت الاسلامیہ، کوثر روڈ، اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

اکبر اور ان کی شاعری

[میثاق کے گذشتہ چار شماروں میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب کا تحریر کردہ ایک مقالہ علامہ اقبالؒ کے سوانح، فلسفہ اور پیغام کے بارے میں شائع ہو چکا ہے۔ پروفیسر صاحب کی ذیل کی تحریر بھی ایک اعتبار سے اسی سلسلے کی ایک کڑی شمار ہو سکتی ہے اس لئے کہ علامہ اقبالؒ نے اپنے اس تعزیتی خط میں جو انہوں نے اکبر کی وفات پر ان کے بیٹے عشرت حسین کے نام لکھا تھا انہیں اپنا "مرشد معنوی" قرار دیا ہے۔ علامہ مرحوم کا پورا خط حسب ذیل ہے :-

"لاہور ۱۲، ستمبر ۱۹۲۱ء

مخدومی السلام علیکم۔

ابھی ابھی "زمیندار" سے آپ کے والد بزرگوار اور میرے مرشد معنوی کے انتقال پُرملال کی خبر معلوم ہوئی۔ ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں میں مرحوم کی شخصیت ہر حیثیت سے بے نظیر تھی۔ اسلامی ادبیوں میں تو شاید ایسی نکتہ رس ہستی پیدا نہیں ہوئی اور مجھے یقین ہے کہ تمام ایشیا میں کسی قوم کے ادبیات کو اکبر نصیب نہیں ہوا۔ کاش اس انسان کا معنوی فیض اس بدقسمت قوم کے لئے کچھ عرصہ اور جاری رہتا"

حیرت ہوتی ہے کہ جس شخص کے بارے میں علامہ مرحوم کی رائے یہ تھی اور جسے وفات پائے ابھی پچاس برس بھی نہیں گذرے ہے قوم نے اس قدر جلد کس طرح بھلا دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہماری نوجوان نسل تو خیر اکبر سے بالکل ناآشنا ہے ہی، اصحاب علم و فن اور صاحبان فکر و نظر کی مجالس میں بھی اب اکبر کا ذکر شاذ ہی رہ گیا ہے۔ اس کا ایک سبب غالباً یہ بھی ہے کہ اکبر کی

شاعری بظاہر نہایت آسان لیکن بباطن بہت مشکل ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ اس میں تلمیحات نہایت کثرت سے استعمال ہوتی ہیں جن کا فہم ان حالات و واقعات کے علم کے بغیر قطعاً ممکن نہیں جن کی جانب ان میں اشارہ کیا گیا ہے۔ بنا بریں کلام اکبر کی مشکلات اور تلمیحات کی شرح وقت کی ایک اہم ضرورت تھی جسے حال ہی میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے پیرانہ سالی اور ضعف اعصاب کے علی الرغم پورا کر کے واقعتہً ملت اسلامیہ پاک و ہند پر ایک احسان کیا ہے۔

پروفیسر صاحب کی یہ کتاب جو حال ہی میں عشرت پبلشنگ ہاؤس نے عمدہ سفید کاغذ پر ۲۲ × ۱۸ کے ۴۴۴ صفحات پر بعنوان "شرح تلمیحات و شرح مشکلات اکبر" شائع کی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ احیاء اکبر کے ضمن میں ایک نہایت اہم سنگ میل ثابت ہوگی۔

ذیل میں ہم پروفیسر صاحب کے شکریے کے ساتھ اس کتاب کا دیباچہ قارئین 'میثاق' کی دلچسپی کے لئے شائع کر رہے ہیں۔ کتاب پر مفصل تبصرہ پروفیسر مرزا محمد منور صاحب کے قلم سے انشاء اللہ بہت جلد شائع ہوگا ——— مدیر]

یہ ۱۹۱۰ء کی بات ہے جب میں نے "فانوس خیال" مولفہ صفدر مرزا پوری میں اکبر مرحوم کا یہ قطعہ زندگی میں پہلی مرتبہ پڑھا تھا :-

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں ۔۔۔ اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا

پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا ۔۔۔ کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

وہ دن ہے اور آج کا دن، کلام اکبر سے میری دلچسپی اور شیفتگی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جوں جوں ان کے کلام کی گوناگوں خوبیاں مجھ پر واضح ہوتی گئیں توں توں شیفتگی میں اضافہ ہوتا گیا اور اضافے کا یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے الحمد للہ علیٰ ذالک

اس واقعے کے بعد سے ۱۹۱۶ء تک ان کا جستہ جستہ کلام مختلف رسائل میں پڑھتا رہا اور حفظ یاد کرتا رہا تا اینکہ ۱۹۱۷ء میں کلیات اکبر کا دوسرا حصہ بریلی (وطن مالوف) میں ایک کتب فروش کی دکان میں حسن اتفاق سے مل گیا۔ کتاب کیا ملی یوں سمجھئے کہ گیمپ کے بجائے

ع دل میں اب نور خدا آگیا، مجنوں کو لیلیٰ مل گئی "

خوشی خوشی گھر آیا اور کھانے سے فارغ ہو کر اس کے مطالعہ میں منہمک ہوگیا۔ ایک نشست میں پوری کتاب پڑھ لی تو دل کو قرار آیا۔

۱۹۱۸ء میں بی اے آنرز کا امتحان دینے الہ آباد گیا۔ جس دن پہنچا اسی دن شام کو مرحوم کی

خدمت میں حاضر ہوا۔ تخت پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے تھے۔ میں نے ادب سے سلام کیا انہوں نے دعا دی اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا اور جب انہوں نے میرے متعلق استفسار کیا۔ تو میں نے عرض کی کہ میں یہاں امتحان دینے آیا ہوں، چونکہ آپ کے کلام کا دلدادہ ہوں اس لئے شرف ملاقات کی غرض سے حاضر ہوا ہوں۔

مرحوم نے یہ بات سن کر اپنے پڑھنے کی عینک پر دوسری عینک لگائی اور مجھے بغور دیکھ کر فرمایا "میرے اشعار کچھ یاد ہیں؟ اگر یاد ہوں تو سناؤ۔"

فرط مسرت سے میری سانس رک سی گئی مگر سنبھلا اور عرض کی، پہلے چند ظریفانہ اشعار سناؤں گا، پھر چند حکیمانہ اشعار پیش خدمت کروں گا۔ اس واقعے کو پچاس برس گذر چکے ہیں۔ اب مجھے یہ تو یاد نہیں ہے کہ میں نے اس وقت کون کون سے اشعار سنائے تھے مگر اتنا یاد ہے کہ پہلا شعر یہ سنایا تھا :-

یا رب ہو خیر اکبر آشفتہ حال کی ۔۔۔ سرجن رقیب اور دوا اسپتال کی

حکیمانہ اشعار میں پہلا شعر یہ سنایا تھا :-

کیوں خدا کے باب میں بحثوں کی اتنی دھوم ہے ۔۔۔ بست میں بشہ نہیں ہے چیست نا معلوم ہے

قدرے متبسم ہو کر فرمایا "اس میں کیا خوبی نظر آئی ؟"

میں نے عرض کی کہ ڈاکٹر فلنٹ[1] نے جو بات دو صفحوں میں لکھی ہے وہ آپ نے صرف دو مصرعوں میں بیان کر دی ہے وہ لکھتا ہے کہ "ہم اتنا تو جان سکتے ہیں کہ خدا ہے مگر اس کی کنہ سے واقف نہیں ہو سکتے"۔

چونکہ جوانی کا عالم تھا اور حدود آداب سے نا آشنا تھا اس لئے مزید سمع خراشی کی جسارت کی۔ اور کہا "دوسرے مصرعے کے پہلے جملے میں جو دعویٰ آپ نے کیا ہے اس کا ثبوت دوسرے شعر میں پیش کر دیا ہے :-

اس تغیر پر بھی ہے ذہنوں میں قائم کوئی چیز ۔۔۔ اور وہ کیا ہے ؟ فقط "یا حق" "یا قیوم" ہے !!

اس کے بعد دو تین شعر اور سنائے جو اب یاد نہیں آتے۔

خوش ہو کر فرمایا "جب فرصت ہو آجایا کرو" میں تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد رخصت ہو کر اپنی قیامگاہ پر واپس آگیا۔ چونکہ میں امتحان سے ایک ماہ قبل آگیا تھا اس لئے الہ آباد میں میرا قیام دو ماہ کے قریب رہا۔ امتحان کی تیاری میں شدید انہماک کی وجہ سے اس عرصے میں صرف پانچ یا چھ مرتبہ عشرت منزل جانے کا اتفاق ہو سکا ذیل میں نہایت اختصار کے ساتھ تین ملاقاتوں کا تذکرہ درج کرتا ہوں۔

[1] ڈاکٹر مذکور کی "THEISM" بی اے پاس کورس میں شامل تھی اور اس وقت سارے مضامین اور مباحث مستحضر تھے اب صرف اتنا یاد رہ گیا ہے کہ ہم خدا کو APPREHEND تو کر سکتے ہیں COMPREHEND نہیں کر سکتے۔

(۱) ایک دن شام کے وقت حاضرِ خدمت تھا تو پنڈت موتی لعل نہرو بلبلِ ہند مسز سروجنی نائیڈو کو ساتھ لے کر مرحوم سے ملنے آئے اور طرزِ تپاک سے میں نے اندازہ کیا کہ پنڈت جی کے دل میں اکبر کا بہت احترام ہے کہنے لگے کہ مسز نائیڈو آپ کے کلام کو بہت پسند کرتی ہیں۔ ان کی بڑی آرزو ہے کہ آپ کا کلام بلاغت التیام آپ ہی کی زبان سے سنیں تاکہ حیدر آباد جا کر اپنے احباب سے فخریہ کہہ سکیں کہ ہم نے "لسان العصر" کا کلام ان ہی کی زبان سے سنا ہے۔"

(۲) ایک دن شام کے وقت مسز اینی بسینٹ[1] ہوم رول لیگ کے چند مقامی کارکنوں کے ساتھ ملنے آئیں۔ ان میں سے ایک صاحب نے مرحوم سے کہا کہ دیوی جی یہ چاہتی ہیں کہ ان کی قائم کردہ لیگ کو عوام میں مقبول بنانے کے لئے ایک نظم ارشاد فرماویں تو بڑا کرم ہوگا۔ حضرت اکبر نے دیوی جی کی دلداری کے لئے ارشاد فرمایا کہ اگر کسی وقت طبیعت موزوں ہو گئی تو آپ کی فرمائش ضرور پوری کروں گا۔

مجھے یہ تو علم نہ ہو سکا کہ مرحوم نے اس موضوع پر کوئی نظم لکھی یا نہیں مگر اتنا جانتا ہوں کہ لیگ کے بارے میں ان کی رائے کچھ اچھی نہیں تھی جیسا کہ اس شعر سے ہویدا ہے۔

مغربی تنظیم ہو اور ہوم رول بات ہو لطفِ موسم ہے یہی مینڈک ہوا اور برسات ہو

(۳) ایک دن سہ پہر کے وقت حاضر ہوا تو فرمایا "اس بات پر اکثر حیران ہوا کرتا ہوں کہ جن لوگوں سے کوئی رشتہ ہے نہ ناتا۔ نہ جان نہ پہچان وہ تو میرے کلام سے اس قدر شغف رکھتے ہیں لیکن میرے بیٹے ...... کو میری شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے صرف ہاں میں ہاں ملانے پر اکتفا کیا اگر دربارِ اکبری میں بے تکلف ہوتا تو وہی زبان سے عرض کر دیتا کہ حضرت آپ نے وہ مثل نہیں سنی "چراغ تلے ......"

خلافِ معمول تھوڑی دیر کے بعد ارشاد فرمایا "چلو ذرا پائیں باغ میں چل کر کچھ دیر ٹہلیں"۔ یہ عاجز اس عزت افزائی پر بہت مسرور ہوا اور مرحوم کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اس پائیں باغ میں پہنچا

[1] مسز موصوفہ سے ۱۹۱۵ء میں گورکھپور میں ملاقات ہوئی تھی۔ چونکہ ہندوؤں کا دل موہنے کے لئے کھدر کی پیلے رنگ کی ساڑھی اور اسی رنگ کی چولی پہنا کرتی تھیں اس لئے ان کے عقیدت مند انہیں بسنتی دیوی کہا کرتے تھے اکبر نے یہ شعر ان ہی کی شان میں کہا تھا۔

تھا بنارس پہلے ہی سے اے صنم رس میں بھرا
چشم مس اینی نے اور اس کو رسیلا کر دیا

ان کی ہوم رول لیگ کی توضیح اس انداز سے کی تھی۔

شیخ کے سانچے بتیں گے موم تو دکھلایئے رول میں حاضر کروں گا ہوم تو دکھلایئے

جو اپنے مالک کی طرح افسردہ اور پژمردہ نظر آ رہا تھا[1]۔ شام کا وقت تھا۔ مغرب کی اذان میں چار پانچ منٹ باقی تھے۔ بائیس سال کا ایک کودن نوجوان بہتر سال کے ایک حکیم فرزانہ[2] کے ساتھ مصروفِ خرام تھا۔ میں بار بار ان کی طرف دیکھتا تھا وہ بار بار ان پھولوں کو دیکھتے تھے۔ جو زبانِ حال سے اللہ تعالیٰ کے عدمِ تعاون کا شکوہ کر رہے تھے۔

یک لخت فرمایا "سنو ایک شعر ہوا ہے۔ میں نے ہمہ تن گوش بن کر عرض کی جی ارشاد۔ فرمایا:

ع دیوارِ چمن کی سیر یہ نہیں ہیں تنہا عالم ہیں ان گلوں میں پھولوں میں بستیاں ہیں

اس زمانے میں یہ کم سواد اس شعر کا مطلب کیا سمجھ پاتا۔ احتراماً چند ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اظہارِ تحسین کر دیا جب اذان ہوئی تو ہم نے وہیں نماز پڑھی اس کے بعد میں ان سے رخصت ہو کر گھر واپس آ گیا۔

امتحان سے فارغ ہونے کے بعد اُن سے رخصتی ملاقات کی۔ انہوں نے اپنی مخلصانہ دعاؤں کے ساتھ مجھے خدا حافظ کہا اور میں دوسرے دن اس شہر سے اپنے وطن کی طرف روانہ ہو گیا جس کی یاد محض اکبر کی وجہ سے میرے دل میں ہنوز تازہ ہے اور ہمیشہ تازہ رہے گی۔

یہ داستان ممکن ہے قارئین کی دلچسپی کا موجب نہ ہو مگر میں نے اسے دانستہ سپردِ قلم کیا ہے کیونکہ مجھے اس میں اس عہدِ رفتہ کی تصویر نظر آتی ہے جو کبھی واپس نہیں آئے گا۔

آمدم بر سرِ مطلب۔ اس بات میں قطعاً مبالغہ نہیں ہے کہ اکبر اس اعتبار سے میرے سب سے بڑے محسن ہیں کہ انہی کے کلام کی بدولت :-

۱: میں مذہب کی روح سے آشنا ہوا۔

اصل اللہ سے لگاوٹ ہے ورنہ مذہب میں سب بناوٹ ہے

۲: میری رسائی توحید تک ہوئی۔

توحید کا مسند ہے اصل باقی ہیں شگوفے بشری کے

۳: میں دین کی اصل سے واقف ہوا۔

[1] ۱۹۱۳ء میں اکبر کے چھوٹے بیٹے ہاشم نے ۱۸-۱۷ سال کی عمر میں وفات پائی اس وفات کا انہیں بہت صدمہ ہوا۔ اس حادثے کے بعد وہ آٹھ سال تک زندہ تو رہے مگر دل کی کلی ایک دن بھی نہ کھلی۔

[2] میں اس وقت انہیں صرف ایک ظریف اور فلسفی شاعر کی حیثیت سے جانتا تھا حالانکہ وہ اس زمانے میں حکیم اور فلسفی سے ترقی کر کے صوفی کے مقام پر فائز ہو چکے تھے۔ لیکن اس وقت میں اس کوچہ سے محض نابلد تھا۔

جو اصل کار دیں ہے وہ فقط وحدت فقط تک ہو — مذہب کو بہت جانچا سب اپنے منہ میاں مٹھو

۴ : یہی حقیقت سے آگاہ ہوا۔

رضائے حق پہ راضی رہ یہ حرفِ آرزو کیسا — خدا خالق، خدا مالک، خدا کا حکم، تو کیسا

۵ : قرآن کی عظمت کا نقش دل پر قائم ہوا :-

معنوی تو ہیں گے تمہیں شیطان سے بہتر — ہادی نہ ملے گا کوئی قرآن سے بہتر

۶ : مسلمان کی پہچان حاصل ہوئی۔

جو غیر خدا کو مانتا ہو قادر! — اکبر بخدا کہ وہ مسلماں ہی نہیں

۷ : خدا اور فطرت کا ربط باہمی معلوم ہوا :

مل ہیں دل سے جو مجھ کو وہ نازک اطلاعیں ہیں — خدا ہے اور فطرت صرف اس کی شعاعیں ہیں

۸ : شریعت اور طریقت میں فرق معلوم ہو گیا۔

شریعت طریقت کو کیا پوچھتے ہو — شریعت ہے قم پر، طریقت ہے قم میں

۹ : دین اور مذہب کا مفہوم واضح ہو گیا۔

خوب اکبر نے یہ اڑائی تان — دین ہے آنکھ اور مذہب کان

۱۰ : تصوف کی ماہیت سے آگاہی حاصل ہوئی۔

سخن میں یوں تو بہت موقع تکلف ہے — خودی خدا سے جھکے بس یہی تصوف ہے

الغرض کہاں تک لکھوں۔ مختصر یہ ہے کہ اکبر نے میری علمی اور ذہنی دنیا میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ فلسفہ و سائنس کی بے مائگی روز روشن کی طرح آشکار ہو گئی اور یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہو گئی کہ خدا رسی کا ذریعہ عقل نہیں ہے بلکہ عشق ہے :

یہ عشق ہی ہے کہ منزل ہے جس کی الا اللہ — خرد نے صرف رہ لا الہ پائی ہے

میرے اوپر اکبر کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ ان کے کلام نے میرے اندر تصوف کا ذوق پیدا کر دیا جو بقول شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنی قدس اللہ سرہ اسلام کی روح اور ایمان کی جان ہے۔

جو دیکھا غور سے یہ بات ثابت ہو گئی آخر — وہی اول وہی آخر وہی باطن وہی ظاہر

یہی توحید حقیقی ہے جس کی تعلیم قرآن حکیم نے دی ہے۔ اگر یہ نکتہ مسلمان کی سمجھ میں آجائے تو غیر اللہ سے خوف یا امید تو بہت بڑی بات ہے اس کا وجود ہی نظروں میں ہیچ ہو جائے۔

اس مقام پر پہنچ کر اکبر کے اس شعر کا مطلب سمجھ میں آسکتا ہے :-

دل میں تو ضعف عقیدت کو کبھی راہ نہ دے — کوئی کچھ دے نہیں سکتا اگر اللہ نہ دے

مدتوں سے دل چاہتا تھا کہ ایسے محسن کے احسانات کا کچھ تو معاوضہ ادا کر دوں یعنی ان کے بعض اشعار کی شرح کروں تاکہ عصر حاضر کے دانش وروں کو یہ معلوم ہو سکے کہ کلام اکبر در حقیقت گنجینۂ حقائق و معارف ہے۔ الحمد للہ کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے مجھے یہ توفیق عطا فرمائی کہ میں اس فرض سے عہدہ برآ ہو سکا جو اکبر کے ایک ادنیٰ عقیدت مند ہونے کی حیثیت سے مجھ پر عائد ہوتا تھا۔

اس جگہ اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ یہ حضرت اکبر ہی کا فیضان تھا جس کی بدولت میں پلوٹائنس، شری شنکر، شیخ اکبرؒ، رومیؒ، جامیؒ، بیدلؒ اور اقبال کو بقدر ظرف خویش سمجھ سکا۔ یہ سب حضرات مسلک وحدت وجود (MONISM) کے علمبردار ہیں۔ اور اکبر نے اس عقیدے ... (DOCTRINE) کو جس دل کش انداز سے پیش کیا ہے اس کی نظیر فارسی میں حضرت بیدلؒ کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتی۔ اس نازک مسئلے کی تشریح اس کتاب میں درج کروں گا جو انشاء اللہ محاسن کلام اکبر پر بہت جلد شروع کرنے والا ہوں۔

دوسرا سبب اس کتاب کی تالیف کا یہ ہے کہ اکبر کے کلام میں تلمیحات کی کثرت ہے چونکہ ان کا سمجھنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے اس لئے ان کی وضاحت اس دور کے نوجوانوں کے لئے ناگزیر تھی۔ میں نے اپنی ناقص فہم کی روشنی میں ہر تلمیح کی وضاحت کر دی ہے اور ہر آیت کا ترجمہ کر دیا ہے۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ میرا نصف صدی کا تجربہ شاہد ہے کہ عوام برطرف بہت سے خواص بھی اکبر کو محض ایک ظریف شاعر سمجھتے ہیں۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جن کو یہ علم ہے کہ وہ ظریف ہونے کے علاوہ ایک مصلح ایک فلسفی اور ایک عارف بھی تھے۔ جس طرح شاعری نے حکیم عمر خیام کے علمی کمالات کو پوشیدہ کر دیا۔ آج کتنے دانشور اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ عمر خیام اپنے زمانے کا ایک نامور فلسفی، حکیم، مہندس اور ہیئت دان تھا اسی طرح ظرافت نے اکبر کے مقام اور ان کی حکیمانہ اور عارفانہ شاعری کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا۔ کتنے علم دوست حضرات ایسے ہیں جو اس بات سے آگاہ ہیں کہ یہ اشعار بھی اکبر ہی کے ہیں :-

کس طرح جانچے گا اپنے آپ کو اے فلسفی — فرق کیا لازم نہیں ہے ناظر و منظور میں

فلسفی بھی نوحہ گر ہیں ذہن کے مقسوم پر — پاتے ہیں معلوم کی بنیاد نا معلوم پر

غم و شادی کی نیرنگی دلیل خود پرستی ہے — وہی دل خوب ہے جس کو فقط ہستی کی مستی ہے

جو اس غرق حیرت کو مجالِ گفتگو کیا ہے — میں کب کہتا ہوں میں وہ ہوں وہی کہتا ہے تو کیا ہے

جوش جنوں میں بھی عمل ذہن چست ہے — احساس میں ہے فرق، تعلق درست ہے

کہہ دیا میں نے کہ ہوں اور یہ نہیں سمجھا کہ کیا
اس خودی کا حشر کیا ہوتا ہے دیکھا چاہیئے

یہ چند اشعار بطور نمونہ لکھ دیئے ہیں ورنہ کلیات میں اس قسم کے فلسفیانہ اشعار کی تعداد ایک ہزار سے بھی متجاوز ہے اور اس سے زیادہ تعداد میں ایسے اشعار موجود ہیں جن میں مذہبی اور دینی حقائق پیش کئے گئے ہیں مثلاً:

تدبیر کی کوئی حد نہ رہی اور بالآخر کہنا ہی پڑا
اللہ کی مرضی سب کچھ ہے بندے کی تمنا کچھ بھی نہیں

ترا دل تو ہمیشہ امر خاطر خواہ چاہے گا
مگر ہوگا وہی اکبر کہ جو اللہ چاہے گا

آنکھوں نے خوب دیکھا اور دل نے خوب سمجھا
کچھ بھی نہیں کہ جو کچھ اللہ کے سوا ہے

اللہ ہی کو جگہ دو تم اپنے دل میں اکبر
اللہ خود ہی دے گا تم کو جگہ دلوں میں

اللہ ہی کو سمجھو مقصود علم و دانش
اللہ ہی کو ڈھونڈو ہستی کی منزلوں میں

جو یائے رازِ حسن ازل سے کہے کوئی
سن صوتِ سرمدی کو کلام مبیں کو دیکھ

ارشاد ہے کہ شرک نہ کر اور نماز پڑھ
معنی یہ ہیں کسی کو نہ دیکھ اور ہمیں کو دیکھ

قارئین انصاف سے کہیں، شرک اور نماز کے یہ معنی اکبر کے سوا کس اردو یا فارسی کے شاعر نے بیان کئے ہیں؟ فارسی میں رودکی سے لے کر قاآنی تک اور اردو میں ولی سے لے کر جگر مرادآبادی تک سب کا کلام نظر سے گذر چکا ہے، یہ معنی کسی نے نہیں بتائے۔

اکبر نے فلسفہ مذہب تو بیان کیا ہی ہے، کمال یہ کیا ہے کہ نفسیات مذہب جیسے ادق موضوع پر وہ نکتہ آفرینیاں کی ہیں کہ کسی اردو شاعر کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آسکتیں۔

مثلاً ایک نظم درج کرتا ہوں، پڑھیے اور لطف اٹھائیے :-

مذہب کے باب میں کوئی کس کو بدل سکے
یہ تو وہ کر سکے کہ جو حس کو بدل سکے

حس امر فطرتی ہے، خدا ہی کی شان ہے
منطق سے پہلے عادت و حس کی اٹھان ہے

میلان طبع ہوتا ہے قائم شروع میں
پھر اس کے آگے رہتی ہے منطق رکوع میں

اس کے خلاف کچھ جو کہیں ہو وہ شاذ ہے
یا جبر یا وہ مصلحتوں کا نفاذ ہے

میں نے اس قسم کی کوئی نظم قصداً اس کتاب میں شامل نہیں کی ہے صرف ابیات پر اکتفا کیا ہے۔ اگر شائقین علم و ادب نے اس کاوش کی کوئی قدر کی تو دوسرے ایڈیشن میں ان نظموں کو بھی اس کتاب کی زینت بنا دوں گا۔

میرا مطلب اس داستان سرائی سے صرف اتنا ہے کہ جو نثر میں نصف صدی سے دیکھ رہا ہوں کہ کوئی شخص نہ اکبر کا فلسفیانہ یا عارفانہ کلام پڑھتا ہے نہ اس کا تذکرہ کرتا ہے تو بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ شاید ان

کا سنجیدہ (فلسفیانہ و عارفانہ) کلام عقول متوسط کی رسائی سے بالاتر ہے اس لئے میں نے اس محبت اور عقیدت کی بنا پر جو مجھے اکبر سے ہے فیصلہ کیا کہ ان کے چند مشکل اشعار کی شرح بھی کر دوں تاکہ دانشوروں کو یہ تو معلوم ہو جائے کہ اکبر کے یہاں فلسفیانہ گہرائی اور عارفانہ گیرائی بھی موجود ہے۔ محض ظریفانہ شاعری ہی ذریعہ عزت نہیں ہے۔

واضح ہو کہ کلیات اکبر میں ابھی اتنے ہی مشکل اشعار اور بھی ہیں جتنے اس کتاب میں درج کئے گئے ہیں۔ اگر میں سارے اشعار کی شرح لکھ دیتا تو کتاب کی قیمت بیس روپے سے کم نہ ہوتی۔ ظاہر ہے کہ ہماری قوم میں جو افراد دولت مند ہیں انہیں علم و ادب سے بہت کم دلچسپی ہے اور جو اس شراب کے رسیا ہیں وہ قیمتی خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔

اس موقعے پر ایک حیرت انگیز لطیفہ یاد آگیا جس کے اندراج سے قارئین کو میری ذہنی کیفیات کا کچھ اندازہ ہو جائے گا۔

کراچی میں میرے دوست سید اقبال جبین صاحب ایم اے نے نیاز فتحپوری کو دعوت دی کہ میرے ساتھ کلفٹن پر چل کر تلی ہوئی مچھلی تناول فرمایئے۔ دوسرے دن چند احباب میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ نیاز صاحب سے میں نے کہا کہ آپ نے جہاں اتنے نمبر نکالے ہیں (مومن نمبر ۱۹۲۸ء تا داغ نمبر ۱۹۵۳ء) بیدل نمبر بھی شائع کر دیجئے۔ فوراً جواب دیا "بجا ارشاد ہوا، خریدار آپ پیدا کر دیجئے نمبر میں شائع کر دوں گا" بات ختم ہو گئی۔

بیدل تو خیر بیدل ہی ہیں۔ ان کی ندرت افکار کے سامنے تو فارابی اور ابن سینا بھی محض فلسفۂ ارسطو کے شارح نظر آتے ہیں۔ خود اکبر نے اپنے ہم عصروں کی پرواز فکر کو دیکھ کر اپنی شاعری کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا ہے :-

نغمات ساز اکبر کی لے کو کون سمجھے
ماہر نہیں ہیں ہم میں اس تال اور سم کے

اس لئے میں نے یہ جسارت کی ہے کہ تلمیحات کو واضح کر دیا ہے[1] اور اکثر مشکل اشعار کی مختصراً شرح

---

[1] مثلاً چند تلمیحات ذیل میں درج کرتا ہوں :

۱- با ابی پنشن کے بدلے چائے دودھ اور کھانڈ لے
یا بیکی پنشن کے بدلے تو چلا جا مانڈ لے

۲- درگا بائی سے راجہ جی جب روٹھے
صدقے ہونے کو ہی نصیبن پہنچیں

۳- مولوی جیل میں بیٹھے کو جو مرغ اڑتا ہے
گنبد چرخ مری آہ سے گونج اٹھتا ہے

۴- مال ایک کو زیادہ چبانا ضرور ہے
پسی ہے دود سیفم، بلیبی تپتیں ہے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

لکھ دی ہے تاکہ طلبہ اور علم دوست حضرات کے دل میں کلام اکبر کے مطالعہ کا شوق پیدا ہو اور وہ اس سے بقدر فہم استفادہ کر سکیں۔ اس بات کا میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ اکبر کے کلام میں دل و دماغ دونوں کی تربیت اور آبیاری کا سامان وافر مقدار میں موجود ہے۔ بطور نمونہ چار اشعار کی ایک نظم ذیل میں درج کرتا ہوں جس میں معانی کی ایک دنیا آباد ہے اگر اس کی شرح کی جائے تو ایک رسالہ مرتب ہو سکتا ہے فرماتے ہیں

تو وضع پہ[۱] اپنی قائم رہ فطرت کی مگر تحقیر[۲] نہ کر — دے پاسِ نظر کو آزادی[۳] خود بینی کو زنجیر[۴] نہ کر

گو تیرا عمل محدود[۵] رہے اور اپنی ہی حد مقصود[۶] رہے — رکھ ذہن کو شائق[۷] فطرت کا بندش[۸] پہ در تاثیر نہ کر

باطن[۹] میں ابھر کر ضبطِ فغاں[۱۰] لے اپنی نظر سے کارِ زباں[۱۱] — دل جوش میں لا فریاد[۱۲] نہ کر، تاثیر[۱۳] دکھا تقریر نہ کر[۱۴]

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت[۱۵] بنے تب کام چلے — ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد[۱۶] نہ رکھ تعمیر نہ کر

چار شعروں میں حکمت اور معرفت کے بیس ایسے نکتے بیان کر دیئے جن میں سے ہر نکتہ موتیوں میں تولنے کے لائق ہو یعنی ذہنی اور روحانی تربیت کا ضامن ہو۔ صرف اسی شاعر کا کام ہو سکتا ہے جو حکیم اور عارف بھی ہو۔

مجھے بڑی خوشی ہے کہ کلام اکبر کے سب سے بڑے جوہری یعنی محترمی مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کا بھی یہی خیال ہے چنانچہ اپنی تفسیر میں یوں رقمطراز ہیں :-

"حضرت اکبر الہ آبادی" اردو کے مشہور شاعر ہونے کے ساتھ ہی حکیم و عارف بھی تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ یہ جو ہم ہر وقت بولا کرتے ہیں کہ "وقت چلا گیا" تو وقت جاتا کہاں ہے؟ (اس کا جواب یہ ہے کہ) اللہ کے ہاں چلا جاتا ہے اور وہیں جمع رہتا ہے۔ قیامت کے دن حق تعالیٰ اسی "وقت" کو واپسی کا حکم دیں گے۔ پس جب وقت واپس آئے گا تو جو کچھ بھی وقت کے اندر ہوتا رہا ہے اس سب کو لئے ہوئے آئے گا اس لئے کائنات میں جو کچھ ہوتا رہا ہے سب اس روز بجنسہٖ دوبارہ واقع ہو کر رہے گا۔"

حاشیہ بقیہ صفحہ گزشتہ

۵ : سینۂ گاندھی میں سانسیں غالباً رکنے لگیں — لکشمی باقی زندگی کی طرف جھکنے لگیں

۶ : ہو تیزی انور کی جو ہوس ہنگامہ کرو تو پوں سے بچو — گاندھی کی جو حکمت ہے تو چپ چاپ گری کے تھان ہو

۷ : طالب رستے تھے جو مضمون مجھ کو ذکر گاندھی سے — خدا جانے کدھر وہ اڑ گئے شیخ کی آندھی سے

۸ : گاندھی نے مان لی ہے مدن موہنی صلاح — ہندی تو تھے ہی اب مدنی بھی وہ ہو گئے

۹ :- آپ نے طاقت کی تو جولانیاں دیکھیں بہت — ضعف کے ہیجان کا بھی اب تماشا دیکھئے

۱۰ :- آکسن بھائی نے قربانی تعصب کی جو کی — جان پل چپ ہو گئے گاؤں کی وقعت بڑھ گئی

غالباً اجابت منفصد کے تحت یہ دس اشعار بالکل کافی ہوں گے اکبر کا ایک چوتھائی کلام ایسی تلمیحات پر مشتمل ہے۔

(حاشیہ تفسیر ماجدی جلد اول صفحہ ۱۲۹ مطبوعہ تاج کمپنی لاہور)

جیسا کہ قبل ازیں لکھ چکا ہوں، اکبر کی شاعری اور اس کی خصوصیات پر ایک مستقل کتاب لکھنے کا عزم تو کر چکا ہوں اور اس کا خاکہ بھی مرتب کر لیا ہے۔ لیکن جب تک توفیق ایزدی شامل حال نہ ہو میں کیا، کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ بقول خود حضرت اکبرؔ :-

یہ عزم ترا سعی سے دمساز ہو کیونکر — اسباب نہ ہوں جمع تو آغاز ہو کیونکر

اسباب کرے جمع، خدا ہی کا ہے یہ کام — طالب ہو خدا ہی سے دعا ہی کا ہے یہ کام

اس لئے میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اپنے فضل و کرم سے اس مجوزہ کتاب کی تالیف کے لئے تمام اسباب ظاہری و باطنی جمع کر دے۔ آمین

المفتقر الی اللہ
یوسف سلیم چشتی
۱۲ر دسمبر ۱۹۶۸ء

اکبر کے مختصر سوانح حیات

حضرت سید اکبر حسین اکبرؔ ۱۶ر نومبر ۱۸۴۶ء کو بمقام قصبہ بارہ ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کا نام سید تفضل حسین تھا۔ ان کا بچپن داؤد نگر ضلع شاہ آباد میں بسر ہوا جہاں ان کے دادا سید فضل محمد قیام پذیر تھے۔ یہیں چار سال کی عمر میں ان کی بسم اللہ ہوئی۔ تعلیم کا آغاز "راہ نجات[۱]" سے ہوا۔ ۱۸۵۶ء میں والدین کے ہمراہ الہ آباد آ گئے۔ والد نے انہیں مشن اسکول میں داخل کر دیا۔ لیکن ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی برپا ہو گئی۔ چونکہ مشن اسکول بند ہو گیا اس لئے انگریزی اسکولی تعلیم کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ ۱۸۵۹ء میں والد نے انہیں ملازمت کرنے کا حکم دیا اس وقت ان کی عمر ۱۳ سال کی تھی۔ کچھ دنوں ایک وکیل کی محرری کی اس کے بعد کلکٹری کے پروانہ نویس کی شاگردی اختیار کی ۱۸۵۹ء میں کام سیکھ کر کلکٹر الہ آباد کی عدالت میں عارضی پروانہ نویس ہو گئے۔ اسی سال باپ نے شادی کر دی۔ گویا یک نہ شد دو شد والا مضمون ہو گیا۔ ۱۸۶۲ء میں یہ عارضی ملازمت ختم ہو گئی تو جمنا کا پل بنانے والے ٹھیکیدار کے پاس ملازم ہو گئے۔ دن میں پتھروں کی پیمائش اور ان کی تعداد رجسٹر میں درج کیا کرتے تھے۔ رات کو انگریزی ریڈر کا مطالعہ کر کے علمی لیاقت بڑھاتے رہتے تھے ۱۸۶۹ء میں نائب تحصیلدار مقرر ہوئے مگر سال بھر کے بعد تخفیف میں آ گئے۔ ۱۸۷۰ء میں الہ آباد

---

[۱] میں نے بھی اپنے بچپن میں یہ کتاب پڑھی تھی اس کی قیمت صرف تین پائی یعنی ایک پیسہ تھی۔

ہائی کورٹ میں ڈگری نویس ہوگئے اور ۱۸۷۳ء میں وکالت کا امتحان پاس کر لیا اور ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی ۱۸۷۳ء میں دوسری شادی کی ۱۸۸۰ء میں قائم مقام منصف مقرر ہوئے۔ اور ۱۸۸۱ء میں مستقل ہوگئے ۱۸۸۲ء میں ان کا تبادلہ بجنور سے جنہ شہر ہوگیا۔ سرسید نے چند ماہ کے بعد علی گڑھ تبادلہ کرا دیا۔ یہاں ۱۸۸۸ء تک مقیم رہے ۱۸۸۸ء میں سب جج ہوکر غازی پور آئے ۱۸۹۳ء میں جج خفیفہ اور ۱۸۹۴ء میں مستقل سیشن جج ہوکر الہ آباد آگئے ان سے پہلے یہ عہدہ یوپی میں کسی مسلمان کو نہیں ملا تھا اس عہدہ جلیلہ پر فائز ہوکر یہ دو شعر کہے ؎

جج بنا کر اچھے اچھوں کا لیا بیٹھے ہیں دل — ہیں نہایت خوشنما وہ جرم ان کے ہاتھ میں
خفتیِ وقت کے گم ہونے کا ہے اکبر کو غم — آفیشِ وقت کا اس کو کچھ مزہ تھا نہیں

۱۸۹۵ء میں عشرت منزل تعمیر کرائی ۱۸۹۸ء میں خان بہادر کا خطاب ملا اس پر یہ شعر کہا ؎

شاعرانہ داد یہ اچھی مجھے دی چرخ نے — تیغ ابرو کا تھا گھائل خان بہادر کر دیا

۱۹۰۰ء میں سہارن پور تبادلہ ہوا چونکہ نماز ظہر کی خاطر نصف ساعت کے لئے عدالت ملتوی کر دیا کرتے تھے اس لئے قطب الارشاد حضرت اقدس مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رح خلیفہ اعظم شیخ العرب والعجم حضرت اقدس حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ نے انہیں مبارک باد کا خط بھیجا اور ترقی دارین کے لئے دعا فرمائی [1]

۱۹۰۲ء میں ہائی کورٹ کی ججی کے لئے ان کا نام بھیجا گیا مگر خود انہوں نے بوجہ شدید ضعف بصارت معذرت پیش کر دی ۱۹۰۳ء میں پنشن ہوگئی اس کے بعد خانہ نشینی اختیار کر لی۔ چنانچہ جب ۱۹۰۵ء میں خان بہادر رضا حسین نے اسلامی کانفرنس کی صدارت کے لئے استدعا کی تو یہ قطعہ ان کی خدمت میں پیش کر دیا ؎

وزن نا محدود میزان نظر میں خوب ہے — نام کی خاطر ترش کر تول ماشے کیوں بنو
دین حق ہے آنکھ زینت ہے تماشے جہاں — تم تماشائی بنو اکبر تماشہ کیوں بنو

۱۹۱۰ء میں آنکھ کا اپریشن ہوا چونکہ کروٹ بدلنے کی اجازت نہ تھی اس لئے ساری نمازیں اشاروں سے ادا کیں گفتگو ممنوع تھی اور آنکھیں بند تھیں اس پر یہ شعر کہا تھا ؎

بے بصر وہ ہیں جو بحثوں میں یہاں خورسند ہیں — جن کی آنکھیں کھل گئیں ان کی زبانیں بند ہیں

جب اپریشن کے بعد آنکھوں پر پٹی باندھ کر ان کو بستر پر لٹایا گیا تو یہ شعر کہا تھا۔

[1] میرا دل کہتا ہے کہ یہ اسی دعا کا اثر تھا کہ ان کی آخری دور کی شاعری حقائق و معارف کا گنجینہ بن گئی اور بقول خواجہ حسن نظامی رح مرحوم کا خاتمہ ایمان پر ہوا۔

روشنی آئے تو ہم دیکھیں ذرا اپنا حساب — لے گئے دو سو تو وہ آنکھوں پہ پٹی باندھ کر

۱۹۱۳ء میں چھوٹے بیٹے کی وفات کا بہت صدمہ ہوا اس پر مستزاد یہ کہ مختلف امراض جسمانی لاحق ہو گئے اس لئے زندگی کے یہ آخری آٹھ سال پریشانی کے عالم میں بسر ہوئے۔ ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو بعارضہ اسہال وفات پائی۔ اگرچہ ان کی آرزو تو یہ تھی کہ مجھے محبوب الٰہی سلطان المشائخ۔ نظام دو عالم شہ ما و طین سلطان نظام الدین اولیاء رح کے قدموں میں دفن کیا جائے اور اسی غرض سے ان کے دیرینہ دوست اور قدر دان خواجہ حسن نظامی مرحوم وفات سے چند گھنٹے پہلے ان کے پاس پہنچ گئے تھے۔ مگر بقول ذوق مرحوم

"مردہ بدست زندہ ....."

ان کے وارثوں نے انہیں الہ آباد ہی میں دفن کر دیا اور خواجہ صاحب ان کے جسم کے بجائے ان کی یاد دل میں لئے ہوئے دلی واپس چلے گئے۔ بہر حال ان کا بیان یہ ہے کہ آخری سانس بھی ذکر سے خالی نہیں تھی۔ اللہ مغفرت فرمائے۔

کیا خدا کی شان ہے جس شخص نے ساری عمر اپنی قوم کو قرآن کا وعظ سنایا۔ اخلاق حسنہ کا درس دیا۔ جنت کا راستہ دکھایا اس کے جنازے میں پچاس آدمی بمشکل شریک ہو سکے۔ سچ کہا تھا انہوں نے :-

شرک چھوڑا تو سب نے چھوڑ دیا — میری کوئی سوسائٹی ہی نہیں !

ہم سے طلب فرمائیے

شرح تلمیحات و شرح مشکلات اکبر

یعنی کلیات حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم کے مشکل اشعار کی تشریح

از قلم : پروفیسر یوسف سلیم چشتی

سائز ۲۲x۱۸/۸ ، صفحات ۴۲۴ ، کاغذ سفید ، مجلد مع ڈسٹ کور

قیمت ۹ روپے ، (محصول ڈاک اس کے علاوہ)

دار الاشاعت الاسلامیہ کوثر روڈ کرشن نگر لاہور (فون ۶۹۵۲۲)

تاریخ تصوف اسلامی

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

ابوالمغیث حسین ابن منصور

الحلاج المصلوب

تمہید حلاج ان لوگوں میں سے ہے جن کی شخصیت ان کی وفات کے بعد محلِ نزاع بن گئی اور آج تک کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ یہ سچ ہے کہ مرور ایام کی بدولت حلاج کی پُراسرار شخصیت بہت دل کش بن گئی ہے اور آج ہر شخص اس کے ساتھ ہمدردی کرتا ہے اور اس کے حق میں کلمۂ خیر ہی کہتا ہے۔ مگر اس کی وفات کے بعد ہی (چوتھی صدی ہجری میں) علماء، زہاد، صوفیہ، مورخین اور محققین کے دو گروہ ہو گئے تھے اور آج تک موجود ہیں۔ ایک گروہ اسے عارف، خدا رسیدہ (خدا مست) اور مرد مومن سمجھتا ہے۔ دوسرا گروہ اس کے برعکس اسے ملحد، زندیق (قرمطی) اور کافر قرار دیتا ہے۔ ان دو گروہوں کے علاوہ ایک تیسرا گروہ بھی ہے جو اس کے بارے میں توقف کرتا ہے۔ نہ اسے مومن کہتا ہے نہ کافر۔ میں اسی طبقے سے تعلق رکھتا ہوں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ حلاج کے متعلق جو شہادتیں مجھ تک پہنچی ہیں ان میں تضاد پایا جاتا ہے۔ ذیل میں وہ شہادتیں تاریخی ترتیب کے ساتھ درج کرتا ہوں :-

(۱) ابونصر سراج المتوفی ۳۷۸ھ نے اپنی تصنیف کتاب اللمع میں پانچ مقامات میں حلاج کا ذکر کیا ہے اور ہر جگہ اس کے نام کے بعد "رحمۃ اللہ علیہ" لکھا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ ان کی نگاہ میں وہ مومن تھا۔

(۲) کلاباذیؒ المتوفی ۳۸۵ھ نے اپنی تصنیف کتاب التعرف میں کئی جگہ حلاج کے اقوال درج کئے ہیں مگر احتیاطاً اس کا نام نہیں لیا۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے زمانے میں بعض علما اور صوفیہ نے حلاج کو رد کر دیا تھا۔

(۳) ابوطالب مکیؒ المتوفی ۳۸۶ھ نے اپنی تصنیف قوت القلوب میں حلاج کا کوئی قول نقل نہیں کیا ہے۔

(۴) ابوعبدالرحمٰن السلمیؒ المتوفی ۴۱۲ھ نے اپنی تصنیف طبقات الصوفیہ میں یہ لکھا ہے کہ "والمشائخ فی امرہٖ مختلفون۔ ردّہٗ اکثر المشائخ ونفوہ وابوا ان یکون لہٗ قدمٌ فی التصوف وقبلہ من جملتھم ابوالعباس بن العطاء و ابوعبداللہ محمد خفیف و ابوالقاسم ابراھیم بن محمد النصر آبادی واثنو علیہ حتی قال محمد خفیف۔ الحسین بن منصور عالمٌ ربانیٌ۔ قتل ببغداد بباب الطاق لستٍ بقین من ذی القعدۃ سنۃ تسع و ثلثمائۃ" (طبقات الصوفیہ صفحہ ۳۰۷ و ۳۰۸ مطبوعہ مصر ۱۳۷۲ھ)

مشائخ کا اس کے معاملے میں اختلاف ہے۔ اکثر مشائخ نے اسے رد کیا ہے اور اس کی نفی کی ہے اور اس بات سے انکار کیا ہے کہ تصوف میں اس کا کوئی مقام ہے۔ لیکن جن لوگوں نے اسے قبول کیا ہے ان میں ابوالعباس بن عطاء، محمد خفیف اور ابوالقاسم نصر آبادی کا نام قابل ذکر ہے۔ ان لوگوں نے اس کی ثنا کی ہے حتیٰ کہ خفیف نے یہ کہا کہ حسین منصور عالم ربانی تھا۔ اُسے بغداد کے باب الطاق میں ۲۴ ذیقعدہ ۳۰۹ھ کو قتل کیا گیا۔

یہ عبارت کسی تبصرے کی محتاج نہیں ہے۔ حلاج کی زندگی ہی میں اس کی شخصیت مبحوث فیہ بن گئی تھی۔ بعض علما اور صوفیہ اسے قرمطی کہتے تھے بعض اُسے مسلمان سمجھتے تھے۔

(۵) ابوالقاسم قشیریؒ المتوفی ۴۶۵ھ نے اپنی تصنیف الرسالۃ القشیریہ میں حلاج کے بارے میں یہ روایت درج کی ہے "ومن المشہور ان عمرو بن عثمان المکی رای الحسین بن منصور یکتب شیئاً فقال ما ھذا؟ فقال ھو ذا اعارض القرآن فدعا علیہ و ھجرہ" (رسالہ قشیریہ صفحہ ۱۰۵ مطبوعہ مصر ۱۳۷۹ھ)

"یہ بات مشہور ہے کہ عمرو بن عثمان مکیؒ (یکے از شیوخ حلاج) نے حسین بن منصور کو دیکھا کہ وہ کچھ لکھ رہا تھا۔ انہوں نے پوچھا کیا لکھ رہے ہو؟ حلاج نے جواب دیا میں قرآن کا جواب لکھ رہا ہوں۔ یہ سن کر انہوں نے اسے ملامت کی اور اس کے پاس سے اٹھ کر چلے گئے"۔

(۶) شیخ علی ہجویری المتوفی ۴۶۵ھ اپنی تصنیف کشف المحجوب میں لکھتے ہیں :-

"حسین بن منصور الحلاج رحؒ اس طریق کے مستوں اور مشتاقوں میں سے تھا۔ حالِ قوی اور ہمت عالی رکھتا تھا۔ مشائخ اس کی شان کے بارے میں مختلف ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک وہ مردود ہے۔ دوسرے گروہ کے نزدیک مقبول ہے"۔ (کشف المحجوب صفحہ ۱۸۹، مطبوعہ ایران ۱۳۳۶ شمسی)

(۷) شیخ فریدالدین عطار الشہید ۶۲۱ھ اپنی تصنیف تذکرۃ الاولیاء میں لکھتے ہیں :-

"غرق دریائے مواج حسین ابن منصور حلاج عجیب و غریب آدمی تھا۔ اغلب مشائخ کبار نے اس کے مرتبے کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ اسے تصوف میں کوئی دخل نہیں تھا۔ مگر محمد خفیف، شبلیؒ اور قشیری اور اکثر متاخرین نے اسے مقبول کیا ہے۔ بعض صوفیہ اس کے معاملے میں متوقف ہیں۔ بعض نے اس کا شمار ساحروں میں کیا ہے۔ بعض اصحابِ ظاہر نے اس کی تکفیر کی ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ وہ اصحاب حلول میں سے تھا بعض نے اس پر اتحاد کا الزام عاید کیا ہے۔[1] اس الزام کی وجہ یہ ہے کہ بغداد میں زنادقہ کی ایک جماعت تھی جو حلول اور اتحاد کی قائل تھی اور اپنے آپ کو حلاج سے منسوب کرتی تھی۔ شبلیؒ نے کہا کہ میں اور حلاج ایک چیز ہیں لوگوں نے مجھے دیوانہ سمجھ کر چھوڑ دیا لیکن حلاج کو اس کی عقل نے ڈبو دیا۔" (تذکرۃ الاولیا جلد دوم صفحہ ۱۳۶ مطبوعہ لیڈن (ہالینڈ) ۱۹۰۷ء)

(۸) عارف جامیؒ المتوفی ۸۹۸ھ اپنی تصنیف نفحات الانس میں لکھتے ہیں :-

"حلاج صوفیہ کے تیسرے طبقے سے متعلق ہے اس کی کنیت ابوالمغیث ہے وطن بیضا ہے۔ مشائخ درکار وے مختلف بودہ اند و بیشتر وے را رد کردہ اند یعنی اس کے بارے میں مشائخ آپس میں اختلاف رکھتے ہیں اور اکثر مشائخ نے اسے رد کر دیا ہے۔ مگر کشف المحجوب میں لکھا ہے کہ جملہ متاخرین صوفیہ نے اسے قبول کیا ہے۔" (نفحات الانس جامی صفحہ ۱۵۰ مطبوعہ ایران ۱۳۳۶ ہجری شمسی)

مشاہیر تصوف کے بعد اب میں مسلم مورخین اور چند غیر مسلم مستشرقین کے خیالات اور نتائج تحقیقات ذیل میں درج کرتا ہوں :-

(۱) پروفیسر براؤن اپنی مشہور تالیف "تاریخ ادبیات ایران" جلد اول میں لکھتا ہے "بقول مولف الفہرست، حلاج ایران کا باشندہ تھا۔ بالیقین نہیں کہا جا سکتا کہ وہ نیشاپور کا رہنے والا تھا یا مرو کا یا طالقان کا یا رے کا یا کوہستان کا۔ صاحب فہرست لکھتا ہے کہ وہ ایک عیار اور شعبدہ باز شخص تھا۔

[1] حلول کا مطلب ہے خدا کا کسی انسان کے جسم عنصری یا جسد مادی میں داخل ہو جانا۔ اسے انگریزی زبان میں (INCARNATION) کہتے ہیں۔ نصاریٰ بالعموم حلول کے قائل ہیں۔ اتحاد کا مطلب ہے خدا اور بندے کا حقیقی اتحاد ہو جانا۔ اسے (FUSION) کہتے ہیں۔ حلول میں خدا اور انسان دونوں مل کر ایک شے ہو جاتے ہیں جیسے پانی اور شکر مل کر ایک تیسری شے شربت بن جاتے ہیں۔ اتحاد میں دونوں اپنی اپنی حالتِ ذاتی پر برقرار رہتے ہیں۔ اسلام کی رو سے حلول اور اتحاد دونوں کفر ہیں۔ وحدۃ الوجود کا عقیدہ ان دونوں عقیدوں سے مختلف ہے اور اسلام کی رو سے کفر نہیں ہے۔ (مولف)

اپنے آپ کو ایک صوفی قرار دیتا تھا۔ انہی کی اصطلاحات میں گفتگو کرتا تھا۔ ہر علم میں جسارت کا مدعی تھا حالانکہ جملہ علوم سے بے بہرہ تھا۔ علم کیمیا سے قدرے واقف تھا۔ اپنے مریدوں کے سامنے الوہیت کا دعویٰ کرتا تھا حلول کی تعلیم دیتا تھا۔ بادشاہوں سے کہتا تھا کہ میں شیعہ ہوں، عوام سے کہتا تھا کہ میں صوفی ہوں اس بات کا مدعی تھا کہ خدا نے مجھ میں حلول کیا ہے۔ جب اسے گرفتار کر کے ابوالحسن علی ابن عیسیٰ (المقتدر عباسی کے وزیر) کے سامنے پیش کیا گیا اور وزیر مذکور نے اس کا امتحان لیا تو اسے تمام دینی علوم سے بے بہرہ پایا۔ جب اسے قید خانے میں بھیجا گیا تو وہاں اس نے اپنے آپ کو سُنی ظاہر کیا ... دراصل وہ شیعوں کے آٹھویں امام علی الرضا کا مقرر کردہ ایک داعی یا مبلغ تھا۔ چنانچہ کوہستان (ایران) میں اسے اسی حیثیت میں گرفتار کیا گیا اور دُرّے لگائے گئے۔ فہرست میں اس کی چھیالیس کتابوں کے نام مندرج ہیں اسے ۹۱۲ء میں گرفتار کیا گیا اور ۹۲۲ء میں پہلے اس کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے پھر قتل کر کے اس کی نعش کو آگ میں جلا دیا گیا۔

بقول عریب، حلاج شیعوں میں شیعہ بن جاتا تھا۔ سنیوں میں سُنی اور معتزلہ میں معتزلی۔ وہ علم طب، علم کیمیا اور افسوں گری میں ماہر تھا۔ وہ خود کو خدا کا اوتار کہتا تھا اور اپنے مریدوں میں سے ایک کو یہ کہتا تھا کہ تو نوح ہے دوسرے سے کہتا تھا کہ تو موسیٰ ہے تیسرے سے کہتا تھا کہ تو محمدؐ ہے۔ رفعِ حیرت کے لئے یہ کہہ دیا کرتا تھا کہ میں نے ان کی ارواح کو تمہارے اندر داخل کر دیا ہے۔ مورخ الصولی جس نے حلاج سے کئی دفعہ ملاقات کی تھی لکھتا ہے کہ وہ ایک جاہل آدمی تھا جو علم کا مدعی تھا۔ صوف کا لباس پہن کر اپنے تقدس اور زہد کی نمائش کیا کرتا تھا۔

ابن مسکویہ نے عریب کے بیان پر یہ اضافہ کیا ہے کہ لوگوں نے یہ کہہ کر حامد وزیر مملکت کی توجہ اس کی طرف مبذول کرائی کہ یہ شخص عوام کو گمراہ کر رہا ہے کیونکہ وہ اس کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ مُردوں کو زندہ کر دیتا ہے۔ جنات اس کے قبضے میں ہیں اور انبیاء کی طرح معجزے دکھا سکتا ہے جب حامد نے اس کے چند مریدوں کو گرفتار کیا تو انہوں نے کہا کہ ہم اسے خدا سمجھتے ہیں کیونکہ وہ مُردوں کو زندہ کر سکتا ہے۔ جب حلاج کو قید خانے میں اس بات کی خبر پہنچی تو اس نے ان سب باتوں کا انکار کیا۔ اس کے بعد خراسان میں اس کے دو مبلغین کو گرفتار کیا گیا جن کے نام ابن بشر اور شاکر تھے۔ ان کے قبضے سے حلاج کی تحریریں دستیاب ہوئیں۔

حلاج بہت بڑا سیاح تھا اس نے رسی کا شعبدہ سیکھنے کے لئے ہندوستان کا سفر بھی کیا تھا۔ اس کی کتابوں میں یہ تحریر بھی ملی کہ حج کرنے کے لئے مکہ جانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ حج گھر میں بھی ہو

سکتا ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ یہ باتیں میں نے حسن بصری کی تحریروں سے اخذ کی ہیں ان خلاف شرع باتوں کی وجہ سے اسے قتل کر دیا گیا۔

ابن جوزی نے لکھا ہے کہ جب حلاج کو دوبارہ گرفتار کیا گیا تو بغداد میں اسے ایک اونٹ پر بٹھا کر بازاروں میں اس کی تشہیر یہ کہہ کر کی گئی کہ "آگاہ ہو جاؤ کہ یہ شخص قرامطہ (دشمنان اسلام) کا داعی ہے"۔ بقول ابن جوزی حلاج کا دادا شہر بیضا کا ایک مجوسی تھا۔ اس نے واسط یا شوستر میں پرورش پائی۔ پھر بغداد آیا۔ جنیدؒ کی صحبت میں رہا۔ اس کے بعد اس نے خراسان، ماوراء النہر اور ہندوستان کا سفر کیا۔ بعض لوگ اسے جادوگر سمجھتے ہیں اور بعض اسے صوفی قرار دیتے ہیں۔ ہندوستان کا سفر اس نے جادو حاصل کرنے کے لئے کیا تھا اس نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ میں قرآن کا جواب لکھ سکتا ہوں۔ ابن جوزی نے یہ بھی لکھا ہے کہ میں نے حلاج پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس میں یہ دکھایا ہے کہ وہ حلول اور رجعت اور تجسّم کی تعلیم دیتا تھا۔

الذہبی نے بھی حلاج پر ایک رسالہ لکھا تھا جو اب ناپید ہے۔ اپنی تاریخ میں انہوں نے حلاج کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ وہ کچھ عرصے تک جنیدؒ، عمرو بن عثمان المکیؒ اور دوسرے صوفیہ کی صحبت میں رہا لیکن اس میں خلوص نہ تھا اس لئے وہ دائرہ ایمان سے باہر نکل گیا۔ اس کے باوجود اکثر متاخرین صوفیہ نے اس کی توصیف میں مبالغہ کیا ہے حتیٰ کہ حجۃ الاسلام امام غزالیؒ نے بھی "مشکوٰۃ الانوار" میں اس کی حمایت کی ہے۔ ابوسعید نقاش نے اپنی تاریخ الصوفیہ میں اس کا تذکرہ کیا ہے اور اس پر سحر اور زندقہ کا الزام عائد کیا ہے"۔ (مقتبس از تاریخ ادبیات ایران جلد اول صفحات ۴۲۸ تا ۴۳۶ مطبوعہ لندن ۱۹۵۱ء)

(۲) امام ابن کثیر المتوفی ۷۷۴ھ نے اپنی مشہور تاریخ "البدایہ والنہایہ" مطبوعہ مصر جلد یازدہم میں صفحہ ۱۳۲ سے ۱۴۴ تک حلاج کا ذکر کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے :-

"حلاج کا دادا مجوسی تھا اس کا نام محمی تھا۔ بیضا میں پیدا ہوا۔ واسط یا تستر میں پرورش پائی۔ پھر بغداد آیا۔ یہاں سے حجاز گیا۔ ایک سال تک مسجد الحرام میں مشغول عبادت رہا۔ شبانہ روز میں قرص (ٹکیہ) کا کچھ حصہ کھاتا تھا اور دو گھونٹ پانی پیتا تھا۔ گرمیوں میں جبل ابوقبیس کے تپتے ہوئے پتھروں پر بیٹھا رہتا تھا۔

خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ "والصوفیہ مختلفون فیہ" صوفیہ کا اس کے بارے میں اختلاف ہے اور اکثر نے یہ کہا کہ وہ ہم میں سے نہیں ہے لیکن بعض صوفیہ نے اسے قبول کیا ہے۔ ابوعبدالرحمن

السلمی نے کہا کہ میں نے منصور بن عبداللہ سے سنا کہ اس نے شبلی کو یہ کہتے سنا "کنت انا والحسین ابن منصور شیئاً واحداً الا انہ اظہر و کتمت" یعنی میں اور حسین بن منصور ایک ہی چیز ہیں مگر اس نے اپنے آپ کو ظاہر کر دیا اور میں نے پوشیدہ رکھا۔

حلاج صوفیہ کے رنگ میں شعر کہتا تھا۔ اس کے قتل کے بعد صوفیہ میں تو اس کے متعلق اختلاف رونما ہوا لیکن فقہا سب اس بات پر متفق تھے کہ وہ کفر کی حالت میں قتل ہوا۔ اس کے حسب ذیل اشعار سے عقیدہ حلول کی تائید ہوتی ہے :-

(۱) جبلت روحک فی روحی کما ۔۔۔ یجبل العنبر بالمسک الفتق

فاذا مسک شیء مسنی ۔۔۔ واذا انت انا لا نفترق

(وله ایضاً)

مزجت روحک فی روحی کما ۔۔۔ تمزج الخمرة بالماء الزلال

فاذا مسک شیء مسنی ۔۔۔ فاذا انت انا فی کل حال

سبحان من اظہر ناسوتہ ۔۔۔ سر سنا لاہوتہ الثاقب

ثم بدا فی خلقہ ظاہراً ۔۔۔ فی صورة الآکل والشارب

(۱) و (۲) تیری روح میری روح میں اس طرح آمیختہ ہو گئی جس طرح عنبر مشک خالص میں یا شراب صاف پانی میں مل کر ایک ذات ہو جاتی ہے۔ جب کوئی شے تجھے مس کرتی ہے تو وہ مجھے مس کرتی ہے اور تو "میں" ہے۔ ہم جدا نہیں ہو سکتے "تو ہر حال میں "میں" ہے۔

(۳) پاک ہے وہ ذات جس نے اپنی ناسوتی شکل میں اپنی منور لاہوتی ذات کو ظاہر کیا ہے اور پھر وہ اپنی مخلوقات کے سامنے ایک کھانے اور پینے والے انسان کی شکل میں ظاہر ہوا۔

ایک شخص نے حلاج سے کہا کہ مجھے ایسی وصیت کر جو نفع بخش ہو جواب دیا۔ "تجھ پر اپنے نفس کی حفاظت فرض ہے۔ اگر تو اسے یاد حق میں محفوظ نہیں رکھے گا تو یقیناً اور لازماً وہ تجھے حق سے باز رکھے گا"۔ خطیب نے اس کا یہ قول بھی سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ "علم الاولین والآخرین کا مرجع یہ چار کلمات ہیں۔ حب الجلیل، بغض القلیل، اتباع التنزیل اور خوف التحویل"۔

ابوعبدالرحمن السلمی نے عمرو بن عثمان المکی سے روایت کی ہے کہ ایک دن میں حلاج کے ساتھ مکے کی گلیوں میں جا رہا تھا اور قرآن پڑھتا جاتا تھا اس نے میری قرأۃ سن کر کہا "یمکننی ان اقول مثل ھذا" اس (قرآن) کا مثل پیش کرنا میرے لئے ممکن ہے۔ یہ سن کر میں اس سے (ہمیشہ کے لئے) جدا ہو گیا۔

خطیب نے لکھا ہے کہ مسعود ابن ناصر نے مجھ سے کہا کہ میں نے بواسطہ ابن باکو ایشرازی ابوذرعہ طبری کو یہ کہتے سنا کہ حلاج کے متعلق لوگوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ میں نے محمد بن یحییٰ سے سنا کہ انہوں نے عمرو بن عثمان المکی کو حلاج پر لعنت کرتے سنا تھا۔ نیز یہ کہ اگر مجھے اس پر قدرت حاصل ہو تو اسے اپنے ہاتھ سے قتل کر دوں۔

ابن جوزی کا قول ہے کہ حلاج کبھی صوفیہ کا لباس پہنتا تھا کبھی علماء کا اور ہر مذہب کے آدمی کا ہم خیال بن جاتا تھا۔ ابو بکر الصولی کا قول ہے کہ میں حلاج سے ملا اور اس سے گفتگو کی تو اسے ایسا جاہل پایا جو عاقل بننے کی کوشش کرتا ہے اور ایسا خبیث پایا جو تقدس کا مدعی ہو اور ایسا فاجر پایا جو عابد ہونے کا مدعی ہو اور ایسا راغب دنیا پایا جو زاہد ہونے کا مدعی ہو۔

جب اسے دار کی طرف لے چلے تو اس کی چال میں تبختر کا انداز تھا اور اس کے پاؤں میں تیرہ بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں اس وقت اس نے یہ اشعار پڑھے :-

ندیمی غیر منسوبٍ الی شیءٍ من الحیف	سقانی مثل ما یشرب فعل الضیف بالضیف
فلما دارت الکاس دعا بالنطع والسیف	کذا من یشرب الراح مع التنین فی الصیف

میرا دوست ظلم و ستم کی طرف منسوب نہیں ہے اس نے مجھے اس طرح جام شراب پلایا
جیسے کوئی مہمان کو پلاتا ہے اور جب پیالہ گردش میں آیا تو اس نے نطع اور سیف منگوا لئے
یہ نتیجہ ہے اس شخص کا جو موسم بہار میں اژدہے کے ساتھ شراب پیتا ہے۔

قتل سے پہلے آخری کلمہ جو اس کی زبان سے نکلا وہ یہ تھا :-

"حسب الواحد افراد الواحد لہ" الواحد کے لئے یہ بات کافی ہے کہ اس کے لئے الواحد کی فردیت کا اثبات کر دیا جائے۔ (جاری)

ہم سے طلب فرمائیے

انوارِ مجددی

یعنی حضرت مجدد الف ثانی رح کے چیدہ چیدہ مکتوبات کا سلیس اور شگفتہ ترجمہ مع تعارف مکتوب الیہم و حواشی مفیدہ

از پروفیسر یوسف سلیم چشتی

سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۳۲۸، مجلد مع ڈسٹ کور، قیمت چار روپے صرف (محصول ڈاک علاوہ)

دارالاشاعت الاسلامیہ کوثر روڈ، کرشن نگر لاہور : (فون ۶۶۵۲۲)

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

تقریظ و تنقید

بائبل سے قرآن تک

حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی رح کی شہرۂ آفاق تالیف "اظہار الحق" کا اردو ترجمہ، شرح اور تحقیق جلد اول۔ ترجمہ از مولانا اکبر علی صاحب استاذ حدیث دارالعلوم کراچی۔ شرح و تحقیق از مولانا محمد تقی صاحب عثمانی استاذ دارالعلوم کراچی۔ زیر نگرانی حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب۔ سائز ۲۰×۲۶/۸ ۶۱۲ صفحات کاغذ سفید۔ کتابت اور طباعت عمدہ، پورے کپڑے کی جلد۔ کتاب کا نام سنہری حروف میں۔ قیمت پندرہ روپے۔ ملنے کا پتہ :۔ مینجر صاحب مکتبہ دارالعلوم کورنگی کراچی ۱۴۔

مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز (۱۲۰۶ء) میں ہندوستان کی بادشاہت عطا فرمائی۔ لیکن سلطان فیروز تغلق کے علاوہ کسی بادشاہ نے تبلیغ و اشاعتِ اسلام کے لئے کوئی تبلیغی ادارہ یا مدرسۂ تدریب المبلّغین قائم نہیں کیا۔ اورنگ زیب جیسے پابند صوم و صلوٰۃ بادشاہ نے بھی تبلیغ و اشاعت اسلام کی طرف کوئی توجہ نہیں کی نہ کوئی تبلیغی کالج قائم کیا نہ کوئی دارالمبلغین قائم کیا نہ تبلیغ کا کوئی نظام قائم کیا۔ نہ قرآن مجید کا ہندی میں ترجمہ کرایا نہ تبلیغ اسلام کو اپنے ماتحتوں کے فرائض میں شامل کیا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ عالمگیر اورنگ زیب کے پوتے کا پوتا شاہ عالم ثانی ۱۸۰۳ء میں انگریزوں کا نمک خوار (وظیفہ خوار) ہو گیا۔ اور جس سلطنت کو بابر نے اپنے برادرانِ دینی کی ہڈیوں پر قائم کیا تھا، اس کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ بالسوء ہو گیا۔

فی الجملہ ہندوستان کے صدہا مسلمان بادشاہوں کے مقابلے میں انگریزوں کا طرز عمل قابل غور ہے۔ ان کی باضابطہ حکومت کا آغاز ۱۷۷۲ء میں ہوا لیکن انہوں نے صرف بیس سال کے بعد یعنی ۱۷۹۲ء میں اپنے مفتوحہ علاقوں میں اپنی سرپرستی میں تبلیغی نظام قائم کر دیا اور اسی سال ولیم کیری، مارشمین اللہ

وارڈ تین پادریوں نے بنگال میں عیسائیت کی تبلیغ شروع کر دی۔ ۱۸۰۱ء میں بنارس سے لے کر پشاور تک تمام شمالی ہند ان کے قبضے میں آگیا تو یہاں بھی حکام اضلاع کی سرپرستی میں پادریوں نے تبلیغ کا نظام قائم کر دیا۔ پہلا انگریز پادری جس نے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی مہم کا آغاز کیا، ہنری مارٹن[1] تھا۔ اس نے ۱۸۰۴ء میں کانپور کو اپنا تبلیغی مرکز بنایا اور ۱۸۰۶ء میں عہد جدید کا فارسی ترجمہ شائع کیا۔ پہلا مسلمان جسے ہنری مارٹن نے بپتسمہ دیا عبد المسیح تھا۔ ہنری مارٹن نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنے وطن آگرے میں جا کر عیسائیت کی تبلیغ کرے۔ اس نے ۱۸۱۶ء میں آگرے میں گرجا تعمیر کیا۔

۱۸۲۶ء میں بشپ ہیبر نے کلکتے سے بمبئی تک تبلیغی سفر کیا تاکہ یہ اندازہ کیا جا سکے کہ مسلمانوں میں تبلیغ کے لیے فضا کس حد تک سازگار ہو چکی ہے۔ اس کی رپورٹ پر گورنر جنرل نے عامۃ المسلمین کو عیسائیت کی دعوت دینے کی منظوری دے دی۔ چنانچہ ۱۸۲۷ء میں کلکتے کے آرچ بشپ مڈلٹن (middleton) نے ایک گشتی مراسلہ شمالی ہند کے سربرآوردہ مسلمانوں کے نام روانہ کیا جس میں اس نے یہ لکھا کہ اب جبکہ خدا نے اس ملک میں مسلمانوں کے بجائے عیسائیوں کو حکومت عطا کر دی ہے اس لئے مناسب ہے کہ مسلمان جوق در جوق اپنے حکمرانوں کے مذہب کو قبول کر لیں۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ یہ مراسلہ ظلِ سبحانی اکبر شاہ ثانی کو بھی بھیجا گیا تھا۔ بادشاہ بیچارہ آفت کا مارا، چونکہ انگریزوں کا نمک خوار تھا اس لئے "شربت" کا گھونٹ پی کر خاموش ہو گیا۔

جب انگریزوں نے یہ دیکھا کہ اس مراسلے کے خلاف کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں ہوئی تو انہوں نے "اللہ" کا نام لے کر، پادریوں کو اسلام کے خلاف کتابیں شائع کرنے اور مسلمان علماء کو مناظرے کی دعوت دینے کی اجازت دے دی۔

اس ہفت خوانِ رستم کو طے کرنے کے لیے آرچ بشپ نے جس شخص کا انتخاب کیا اس کا نام پادری ڈاکٹر کرسچین جارج فانڈر (REV. DR. C.G. PFANDER) تھا۔ یہ جرمن نژاد پادری ہندوستان

[1] ۱۹۳۱ء میں پروٹسٹنٹ تبلیغی جماعتوں نے لاہور میں ہنری مارٹن سکول آف اسلامک سٹڈیز قائم کیا تاکہ اس کے نام کو زندہ رکھا جا سکے۔ یہ سکول کچھ عرصے کے بعد علی گڑھ منتقل ہو گیا اور آجکل لکھنؤ میں ہے۔ اس درسگاہ میں ان عیسائی گریجویٹوں کو جو کسی عیسائی مدرسہ الٰہیات کے فارغ التحصیل ہوں، اسلامی علوم پڑھائے جاتے ہیں تاکہ وہ مسلمانوں کو بہترین طریق پر عیسائیت کی دعوت دے سکیں۔

آنے سے پہلے اس جرمن تبلیغی مشن سے وابستہ تھا جس کا مرکز صوبہ جارجیا کے سرحدی شہر فورٹ شوشی میں تھا۔ یہ پادری اپنے تبلیغی اسفار کے سلسلے میں تبریز، بغداد، اصفہان اور تہران جایا کرتا تھا اس لئے فارسی زبان بخوبی جانتا تھا، چنانچہ ۱۸۳۵ء میں اس نے اپنی پہلی اور اہم تصنیف 'میزان الحق' فارسی زبان میں شائع کی جس میں اُس نے بزعم خویش اسلام کا ابطال اور عیسائیت کا اثبات کیا تھا۔

فانڈر ۱۸۳۷ء میں ہندوستان آیا اور یہاں آکر اس نے میزان الحق کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔ ہندوستان میں یہ پہلی کتاب تھی جو اسلام کے خلاف شائع ہوئی اور شمالی ہند کے اکثر علماء کے پاس بھیجی گئی۔ ۱۸۴۳ء میں اس کا اردو ترجمہ بھی شائع کیا گیا۔

۱۸۴۰ء میں فانڈر نے دوسری کتاب شائع کی جس کا نام 'مفتاح الاسرار' تھا۔ اس کتاب میں اس نے عقیدۂ تثلیث اور عقیدۂ الوہیت مسیح کو عقلی دلائل سے ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی۔ ناکامی پر سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ولیم میور[1] جیسے معاندِ اسلام نے اپنے ایک مضمون میں اس بات کا اعتراف کیا کہ "جو دلائل فانڈر نے تثلیث کو عقل سے مطابق ثابت کرنے کی غرض سے دیئے ہیں وہ تسلی بخش نہیں ہیں"۔ اس کے بعد ۱۸۴۱ء میں اُس نے تیسری کتاب شائع کی جس کا نام 'طریق الحیات' تھا۔ اس کتاب میں اس نے موروثی گناہ اور کفارۂ مسیح پر عقلی دلائل پیش کئے۔

لکھنؤ کے شیعہ مجتہد نے مفتاح الاسرار کی تردید میں 'کشف الاستار' لکھی۔ اس کے جواب میں فانڈر نے حل الاشکال لکھی جو اس کی چوتھی تصنیف تھی۔

ان کتابوں کے علاوہ فانڈر نے علماء سے تحریری مناظرے بھی کئے۔ آخری تحریری مناظرہ ۱۸۵۵ء میں بمقام آگرہ اس کے اور مولوی سید آل حسن سہسوانی مرحوم کے درمیان ہوا تھا۔ مولوی صاحب کے معاون ڈاکٹر وزیر خان صاحب مرحوم تھے۔ جنہوں نے مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی

[1] سر ولیم میور جو لیفٹیننٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی اور اودھ کے عہدے سے ریٹائر ہوا، ان انگریز حکام میں سب سے زیادہ نامور تھا جنہوں نے حکومت برطانیہ کے عہدیدار ہونے کے باوجود تبلیغ میں غلو حصہ لیا۔ اس کی تالیف سیرت محمدؐ کا جواب سرسید نے خطبات احمدیہ کے نام سے لکھا۔ عربی اور فارسی ہندوستان کے مشہور علماء سے پڑھی تھی جن میں ڈپٹی نذیر احمد کا نام قابلِ ذکر ہے۔ اسی کے ایماء پر نذیر احمد صاحب نے انڈین پینل کوڈ کا اردو میں ترجمہ کیا تھا جس کے صلے میں اس نے انہیں ڈپٹی بنا دیا اور ڈپٹی صاحب کے ترجمۂ قرآن پر اسی نے انہیں ایڈنبرا یونیورسٹی کی طرف سے ایل ایل ڈی کی ڈگری عطا کی تھی۔

مرحوم کے ساتھ بھی تعاون کیا تھا۔ اور فانڈر کا معاون پادری ٹی۔ وی۔ فرنچ تھا جو اس زمانے میں سینٹ جان کالج آگرہ میں پروفیسر تھا۔[1] سہسوانی مرحوم کے بارے میں میور نے یہ اعتراف کیا ہے کہ "مولوی صاحب (very superior abilities) نہایت اعلیٰ قابلیتوں کے مالک ہیں اور باعتبار علم و فضل محمدی سوسائٹی میں انہیں بہت اونچا مقام حاصل ہے"۔

اس تحریری مناظرے میں جانبین کی طرف سے ٢٢ خطوط (مراسلات) کا تبادلہ ہوا۔ مولانا سہسوانی مرحوم نے فانڈر کا ناطقہ ایسا بند کیا کہ اس نے ان کے آخری خط کا جواب دیئے بغیر اس سلسلے کو ختم کر دیا اور اپنی ناکامی پر کف افسوس ملتا ہوا ١٨٥٦ء میں ہندوستان ہی کو خیرباد کہہ گیا۔ یہ مناظرہ اسی سال "مراسلات مذہبی" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہو گیا تھا۔

١٨٣٨ء سے ١٨٥٥ء تک جتنی کتابیں فانڈر نے لکھیں اور سنی شیعہ علماء نے ان کے جس قدر جوابات لکھے، یہ سب کتابیں میں نے ١٩١٥ء اور ١٩٢٥ء کے درمیانی عرصے میں پڑھی تھیں۔ میں ان کی تفصیلات سے قصداً قطع نظر کرتا ہوں کیونکہ اس صورت میں یہ تبصرہ، جو اب بھی اپنی جائز حدود سے متجاوز ہو چکا ہے، ہندوستان میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان مناظروں کی تاریخ کی صورت اختیار کر لے گا۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے اکبر مرتد کے "دین الٰہی" کی تردید کے لیے حضرت مجدد الف ثانیؒ کو پیدا کیا تھا اسی طرح فانڈر کے فتنۂ عظیمہ کے استیصال کے لئے اللہ تعالیٰ نے مجاہد ملت حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کو پیدا فرمایا جنہوں نے اللہ کے فضل و کرم سے تن تنہا اُن تمام عیسائی پادریوں کو شکست فاش دی جن کو ہر قدم پر حکومت کی تائید حاصل تھی۔ مناظرے کے علاوہ مولانا نے نانڈر کی تمام کتابوں کا رد لکھا اور اپنی طرف سے بھی اعتراضات قائم کئے۔ اس سلسلے کی آخری

---

[1] پادری فرنچ ١٨٢٠ء میں پیدا ہوا تھا، ١٨٤٥ء میں کلیسائے انگلستان کی طرف سے پادری مقرر ہو کر آگرہ آیا اور ١٨٦٨ء میں اسے پنجاب میں تبلیغ کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ اس نے ١٨٦٩ء میں لاہور میں مبلغین کی تربیت کے لیے مدرسہ الٰہیات قائم کیا جس کا نام سینٹ جانز ڈیوینٹی سکول تھا۔ ١٨٧٧ء میں اسے پنجاب کا بشپ بنا دیا گیا۔ عبرانی، سریانی، یونانی، لاطینی، جرمن اور فرنچ زبانوں کے علاوہ عربی، فارسی، اردو اور پنجابی زبانیں بھی جانتا تھا۔ ١٨٩١ء میں عیسائیت کی تبلیغ کے لئے مسقط کا سفر اختیار کیا۔ وہیں ١٨٩٢ء میں وفات پائی۔ کاش مسلمانوں میں کوئی فرنچ پیدا ہو جائے۔

کتاب اظہار الحق تھی جسے مولانا نے زمانۂ قیام قسطنطنیہ میں تحریر فرمایا تھا۔

یہ کتاب بلاشبہ ان کا شاہکار ہے اور اپنے موضوع پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ بڑی مسرت کا مقام ہے کہ مکتبۂ دار العلوم کراچی نے اس معرکۃ الآراء کتاب کا اردو ترجمہ مع مقدمہ شائع کیا ہے۔ ترجمہ مولانا اکبر علی صاحب نے کیا ہے اور مقدمہ مبسوط مولوی محمد تقی عثمانی سلمہُ اللہ القوی نے لکھا ہے چونکہ اس کم سواد کی عمر کا بڑا حصہ بھی تقابلِ ادیان کی وادیوں میں بسر ہوا ہے اس لئے میں بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مقدمہ مشتمل بر ردِّ عقائدِ نصاریٰ، فاضل مقدمہ نگار کی ژرف نگاہی اور قوتِ استدلال پر ایک روشن دلیل ہے۔ علاوہ ازیں اُن کے لیے یہ بات بھی قابل فخر ہے کہ انہیں حضرت مولانا کیرانویؒ کی اس خدمت عظمیٰ کے ساتھ ایک قابلِ قدر نسبت بھی حاصل ہو گئی ہے۔

صفحہ ١٨٩ پر فانڈر کے نام کے ابتدائی حروف غلط درج ہو گئے ہیں۔ اسمائے C. G. PFANDER تھا۔ امید ہے اگلے ایڈیشن میں اس غلطی کو درست کر دیا جائے گا۔

جس طرح اردو زبان میں اظہار الحق کا جواب نہیں ہے اسی طرح جو مقدمہ اس پر لکھا گیا ہے وہ بھی اپنی جگہ لاجواب ہے۔ یہ عاجز اس موقع پر مفتی محمد شفیع صاحب کو مبارکباد دیتا ہے کہ اللہ نے انہیں ایسا لائق و فائق فرزند عطا فرمایا۔ اللہ ان عزیز سلمہ کو دین کی خدمت کی بیش از بیش توفیق عطا فرمائے۔ اور اولین فرصت میں دوسری جلد کی طباعت کی توفیق ارزانی فرمائے۔

٢۔ "بنو ہاشم اور بنو امیہ کے تعلقات"

مؤلفہ سلام اللہ صاحب صدیقی، سائز $\frac{20\times30}{16}$، ١١٢ صفحات، غیر مجلد قیمت دو روپے۔ شائع کردہ مکتبہ اسلامی ادب ١٩/٢ بلّہ پورہ (فاطمان) وارانسی (بنارس)۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ صدیقی صاحب نے یہ کتاب لکھ کر مسلمانوں پر بڑا احسان کیا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ مسلمان بالعموم یہ سمجھتے ہیں کہ بنو امیہ اور بنو ہاشم میں بڑی عداوت اور دشمنی تھی۔ صدیقی صاحب نے تاریخی شواہد کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ ان میں کسی قسم کی عداوت یا دشمنی نہیں تھی۔ جب میں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا تو مجھ پر ایک خوشگوار حیرت طاری ہو گئی۔ تبصرے میں پوری کتاب تو نقل نہیں کی جا سکتی مگر جستہ جستہ اقتباسات ضرور پیش کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ ناظرین بھی اس حیرت سے بہرہ ور اور لطف اندوز ہو سکیں۔

(١) امام مظلوم حضرت عثمانؓ کے آخر دورِ خلافت میں جب سبائیوں نے ان پر یہ جھوٹا الزام لگایا کہ انہوں نے اصلی قرآن کو جلا دیا تو اس کی تردید میں حضرت علیؓ نے یہ فرمایا کہ "انہوں نے اختلاف والی

چیز کو جلا دیا اور متفق علیہ کو باقی رکھا جو آنحضرت صلعم کی آخری تلاوت سے ثابت ہے۔ خدا کی قسم اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو وہی کرتا جو انہوں نے کیا (البدایہ والنہایہ ۷/۱۷۱)

(۲) جب سبائیوں نے حضرت عثمان رضؓ کے مکان کا محاصرہ کرکے ان پر آب و دانہ بند کر دیا تو حضرت علی رضؓ ان کے پاس گئے اور باغیوں کے خلاف جہاد کی اجازت طلب کی اس پر خلیفہ مظلوم رضؓ نے ان سے فرمایا کہ میں مسلمانوں کے قتل کی ابتدا کرنی نہیں چاہتا۔ یہ سن کر حضرت علی رضؓ یہ کہہ کر واپس آگئے کہ اے اللہ! تو خوب جانتا ہے کہ اب میں معذورین میں سے ہوں۔" (سیرۃ ذی النورین ۲/۲۱۹)

(۳) شہادتِ عثمان رضؓ کے بعد حضرت علی رضؓ قاتلانِ عثمان رضؓ پر لعنت بھیجا کرتے تھے چنانچہ شیعہ مفکر سید علی نقوی نے لکھا ہے کہ حضرت علی رضؓ نے فرمایا کہ "خدا کی لعنت ہو اُن لوگوں پر جنہوں نے عثمان بن عفانؓ کو قتل کیا" (رجال بخاری ۱/۱۵۰ امامیہ مشن لکھنؤ)

(۴) ایک موقع پر حضرت علی رضؓ نے یہ فرمایا کہ "حضرت عثمان رضؓ ہم سب سے افضل تھے، سب سے زیادہ رحیم تھے، ہم سب سے زیادہ پاکباز اور متقی تھے۔" (البدایہ والنہایہ ۷/۱۹۲)

(۵) جنگ صفین کے بعد حضرت معاویہ رضؓ نے حضرت علی رضؓ کو لکھا کہ اے ابن عم! جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب آپ کو صلح کر لینی چاہیئے۔ اس پر حضرت علی رضؓ راضی ہو گئے۔ (تاریخ ابن اثیر ۳/۳۲۴)

(۶) جب جنگ صفین کے زمانے میں ایک عیسائی بادشاہ نے حضرت معاویہ رضؓ کو فوجی امداد کی پیشکش کی تو انہوں نے اُسے یہ جواب دیا کہ اگر میرے بھائی (حضرت علی رضؓ) تیرے خلاف فوجکشی کریں تو میں ان کی فوج میں سپاہی کی حیثیت سے تیرے خلاف جنگ کروں گا (البدایہ والنہایہ ۸/۱۱۹) اس جواب سے واضح ہوا کہ حضرت معاویہ رضؓ کے دل میں حضرت علی رضؓ سے کوئی بغض نہیں تھا محض اصولی اختلاف تھا۔

(۷) بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضؓ ہر نماز کے بعد حضرت معاویہ رضؓ پر لعنت بھیجا کرتے تھے۔ لیکن تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ لعنت کرنی کجا؟ وہ تو دوسروں سے بھی ان کی بُرائی سُننا پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ صفین کے بعد جب بعض لوگ حضرت معاویہ رضؓ کو بُرا کہنے لگے تو حضرت علی رضؓ نے فرمایا "معاویہ رضؓ کو بُرا مت کہو۔ جب وہ تمہارے درمیان سے اٹھ جائیں گے تو تم دیکھو گے کہ بہت سے سر تن سے جدا کئے جائیں گے (تاریخ الخلفا صفحہ ۲۱۸ بحوالہ ابن عساکر)

(۸) جب بعض سبائیوں نے حضرت معاویہ رضؓ کو کافر کہنا شروع کیا تو حضرت علی رضؓ نے ایک گشتی فرمان جاری کیا جس کی عبارت یہ تھی۔ "ہمارا اور اہلِ شام کا خدا ایک ہے، رسول ایک ہے،

اسلام ایک ہے۔ ہاں خونِ عثمان رضؓ کے بارے میں ہمارے اور اُن کے درمیان اختلاف ہے اور ہم خونِ عثمان رضؓ سے بری ہیں (نہج البلاغۃ ۳/۱۲۵)

(۹) جب حضرت معاویہ رضؓ کو یہ خبر ملی کہ حضرت علی رضؓ کو ان کے ایک باغی مرید ابن ملجم نے قتل کر دیا تو بے اختیار رونے لگے۔ ان کی بیوی نے حیران ہو کر سبب پوچھا تو فرمایا تمہیں کیا خبر؛ دنیا کا سب سے بڑا عالم شہید ہو گیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ حضرت معاویہ رضؓ کا دل حضرت علی رضؓ کی طرف سے بالکل صاف تھا۔

(۱۰) شیعہ مورخ ابن الحدید نے لکھا ہے کہ "معاویہ رضؓ دنیا میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے حضرت حسن اور حضرت حسین کو دس لاکھ درہم عطا کئے"۔ (ناسخ التواریخ ۶/۷۸ - ابن الحدید ۲/۸۲۳ تاریخ الامۃ ۲/۷)

(۱۱) جب حضرت حسن رضؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے کوفیوں سے فرمایا کہ "میرے والد مجھ سے فرمایا کرتے تھے کہ معاویہ رضؓ کی امارت قبول کرنے سے کراہت مت کرنا"۔ (البدایہ ۸/۱۳۱- ابن الحدید ۳/۸۳۶)

(۱۲) حضرت حسن رضؓ کی طرح حسین رضؓ بھی حضرت معاویہ رضؓ کی بہت عزت کرتے تھے۔ ایک بار انہوں نے جامع دمشق میں خطبہ دیا اور فرمایا "اے آلِ محمدؐ تم میں سے جو بھی حشر کے دن لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوا آئیگا وہ بخشا جائے گا"۔ اس پر حضرت معاویہ رضؓ نے پوچھا اے میرے بھتیجے: آلِ محمد کون ہیں؟ حضرت حسین رضؓ نے جواب دیا "جو حضرات ابوبکر رضؓ، عمر رضؓ، عثمان رضؓ، علی رضؓ اور آپ کو گالیاں نہیں دیتے"۔ (ابن عساکر ۴/۳۱۲)

(۱۳) شیعہ مؤرخ ابن طقطقی نے لکھا ہے کہ "امیر معاویہ رضؓ نہایت حلیم اور بردبار تھے جب ابن عباس رضؓ ان کے پاس گئے تو انہوں نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان کا وظیفہ مقرر کیا۔ اس کے علاوہ عطیات بھی دیتے رہے"۔ (الفخری صفحہ ۹۴)

(۱۴) امام ابن حزم لکھتے ہیں کہ جب ۵۳ھ میں امیر یزید مغفور[لہ] نے امارت حج کی خدمت انجام دینے کے بعد مدینہ منورہ کی زیارت کی تو اس موقع پر حضرت عبد اللہ ابن جعفر طیار رضؓ نے جو حضرت حسن ابن علی رضؓ کے حقیقی بہنوئی تھے، اپنی بیٹی سیدہ اُمِّ محمد کا عقد امیر یزید بن معاویہ رضؓ کے ساتھ کر دیا۔ (جمہرۃ الانساب صفحہ ۶۲)

(۱۵) بعض لوگ مروان بن حکم رضؓ کو حضرت حسن رضؓ اور حضرت حسین رضؓ کا دشمن سمجھتے ہیں لیکن حضرت

(لہ حاشیہ آئندہ صفحے پر دیکھیں)

حسین رضؓ کی دو بہنیں خدیجہ بنت علیؓ اور رملہ بنت علیؓ انہی مروان بن حکمؓ کے بیٹوں سے بیاہی گئی تھیں اور خود حضرت حسین رضؓ کی بیٹی سیدہ سکینہ، مروان بن حکمؓ کے پوتے اصبغ ابن عبدالعزیز سے بیاہی تھیں۔ (طبقات ابن سعد ۸/۴۰۵ - ابن قتیبہ ۱/۱۲۲)

(۱۶) جب حضرت مروان بن حکمؓ کا وقت رحلت قریب ہوا تو انہوں نے اپنے بیٹے عبدالملک کو وصیت کی کہ علی بن حسین رضؓ نے مجھ سے ایک لاکھ درہم قرض لئے تھے مگر میرے مرنے کے بعد تم ان سے اس رقم کا مطالبہ مت کرنا (البدایہ ۹/ ۱۰۴)

(۱۷) جب امیر یزید بن معاویہؓ نے مدینے کی بغاوت فرو کرنے کے لئے فوج بھیجی تو امیر لشکر کو ہدایت کی کہ علی بن حسینؓ کے ساتھ رعایت کرنا اور انہیں عزت کے ساتھ تخت پر بٹھانا کیونکہ وہ اس بغاوت سے الگ ہیں اور انہوں ہی نے مجھے لکھ کر اس بغاوت سے مطلع کیا ہے۔ (طبری ۴/۳۰۲)

حضرت زین العابدین علی بن حسینؓ کے فرزند حضرت محمد باقرؒ نے بایں الفاظ اس بات کی تصدیق کی ہے کہ جب میرے والد مسلم بن عقبہ سے ملنے گئے تو انہوں نے میرے والد کو تخت پر بٹھا دیا اور مزاج پرسی کی۔ والد صاحب نے جواب میں اللہ کا شکر ادا کیا۔ مسلم نے کہا کہ امیرالمومنین (یزیدؒ) نے مجھے آپ کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت کی ہے۔ والد صاحبؒ نے فرمایا "اُن کے لئے اللہ کی سلامتی ہو اور اس کی طرف سے جزائے خیر" (جلاء العینین صفحہ ۲۴۶ - الامامۃ والسیاسۃ صفحہ ۲۳)

(۱۸) جب حضرت محمد ابن الحنفیہؒ (فرزند حضرت علیؓ) امیر یزیدؒ سے ملاقات کے بعد مدینے واپس آئے تو باغیوں کے امیر ابن مطیع نے ان سے کہا کہ یزید فاسق و فاجر اور شرابی ہے اس لئے آپ اس کی بیعت توڑ دیں تو ابن الحنفیہؒ نے کہا "خدا سے ڈرو - کیا تم نے اسے یہ سب (فسق و فجور) کرتے

(بقیہ صفحہ ۸۵ پر)

لے میں نے امیر یزیدؒ کے نام کے ساتھ لفظ مغفور اس لئے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیش گوئی فرمائی تھی کہ "پہلا لشکر جو قیصر کے شہر پر حملہ کریگا وہ مغفور ہے"۔ چونکہ صحابہؓ یہ یقین رکھتے تھے کہ حضور صلعم مخبر صادق ہیں اس لیے اکثر اکابر صحابہؓ مغفرت حاصل کرنے کی نیت سے اس لشکر میں شامل ہوئے ان میں حضرت حسینؓ کے علاوہ حضرت ابوایوب انصاریؓ بھی تھے۔ حضرت یزیدؒ اس لشکر کے امیر تھے اور اسی حیثیت سے سب لوگ ان کے پیچھے نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ چونکہ میں حضور صلعم کو صادق یقین کرتا ہوں اس لیے امیر یزید کو مغفور جانتا ہوں۔

ہم سے طلب فرمائیں :

لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ

تاکہ حق کو حق ثابت کر دے اور باطل کو باطل (سورۃ انفال)

اسلامی تحقیق کا مفہوم، مدعا اور طریق کار

تالیف
ڈاکٹر محمد رفیع الدین
ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ ڈی لٹ

ہمارے تحقیق اسلامی کے اداروں کے سامنے کرنے کا اصل کام

قیمت قسم اعلیٰ : ڈیڑھ روپیہ ،
قسم ادنیٰ ایک روپیہ (محصول ڈاک اس کے علاوہ)

★

سلسلہ مطبوعات قرآن اکیڈمی نمبر ۱

اسلام کی نشاۃ ثانیہ کرنے کا اصل کام

تالیف : اسرار احمد

★ فکرِ مغرب کا ہمہ گیر استیلاء ★ ابتدائی نقطۂ نظر ★ عالم اسلام پر مغرب
کی سیاسی و فکری یورش ★ مدافعت کی اولین کوششیں اور ان کا ماحصل
★ علوم عمرانی کا ارتقاء ★ اسلامی نظام حیات کا تصور اور بیسویں صدی
عیسوی کی اسلامی تحریکیں ★ تعبیر کی کوتاہی ★ احیائے اسلام کی شرط
لازم : تجدید ایمان ★ کرنے کا اصل کام ★ عملی اقدامات

مع

"فکر مغرب کی اساس اور اس کا تاریخی پس منظر"

از قلم : یوسف سلیم چشتی

سائز ۱۸ × ۲۲/۸ ، صفحات : ۵۶ ، طباعت آفسٹ ، قیمت : ایک روپیہ

★

شائع کردہ

دار الاشاعۃ الاسلامیہ لاہور

کوپر روڈ ، اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور - ۱ (فون 69522)